

# جلتے گلاب

عثمان غنی خان



**PAKISTANIPOINT**

[WWW.PAKISTANIPOINT.COM](http://WWW.PAKISTANIPOINT.COM)

# جلتے گلاب

عثمان غنی خان - پشاور

قسط نمبر: 1

دو دلوں کا ملاپ اچانک چھنکے سے بکھر گیا، دونوں کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اس قدر عجلت میں وہ ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گے اور جب ایسا ہوا تو ایک انوکھا شاخسانہ سامنے آیا تو انجان سفر کے باسی گھٹ کر رہ گئے لیکن جب وقت پلٹا تو.....

ایک اچھوتی انوکھی دلک دلوں اور فرحت بخشی دل دماغ کو گدگداتی شابکار کہانی

کہا، وہ خوشبو چکراتی ہوئی، گھر سے باہر نکل آئی رات کے اندر سے میں محلے میں گھومتی ہوئی، ایک کی دیوار سے اوچی ہو کر اندر چلی گئی۔ اب وہ دھواں گلاب کی خوشبو کا تھا۔ اس گھر کے ایک کمرے میں داخل ہو گیا۔ کمرے کے اندر دو لڑکیاں ساتھ جڑے سنکھل پر سو رہی تھیں۔ دھواں ایک لڑکی کے منہ اور ناک اندر داخل ہو گیا۔ اور وہ جیسے ہی اس کے اندر گیا، پھر لڑکی کے اندر سے کچھ لحوں بعد سفید دھواں باہر آیا، جو کہ اب اس کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ وہ امر روح تھی۔ جو کہ اب باہر جا رہا تھا۔ وہ روح حیرت مگر کچھ کر نہیں سکتی تھی۔ وہ اب دھویں کی شکل اختیار ہوئی اسی طرح کلی میں جا رہی تھی۔ اب وہ اسی گھر داخل ہو گئی، جس میں وہ آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ روح کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔

وہ گلاب کا پودا اب مرجھایا ہوا لگ رہا تھا۔ شخص نے روح کو اپنی نظروں سے قابو میں کیا۔ اور وہ روح گلاب کے پودے میں جذب ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ روح جیسے ہی اس میں داخل ہوئی، گلاب کا پودا کھل اٹھا۔

☆.....☆.....☆

**جلتے** گلاب کا پودا جس پر تین گلاب کے پھول تھے، اور تینوں ڈھڑا ڈھڑا آگ کے شعلوں میں جل رہے تھے، اس آگ میں ایک لڑکی کا عکس بھی نظر آ رہا تھا، وہ چہرہ بہت خوبصورت تھا۔ مگر اس کی آنکھوں سے آنسو نکل کر اس کے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔ جلتے گلاب کا یہ پودا، ایک ویران سنان میدان میں اگا ہوا تھا۔ جس میں وہ گلاب کا پودا جلنے کے باوجود بالکل تروتازہ تھا۔ اور مرجھائیں رہا تھا۔ مگر اس پودے کو کوئی عام انسان نہیں دیکھ سکتا تھا۔ کیونکہ اسے صرف چند لوگ دیکھ سکتے تھے، وہ لوگ جنہوں نے جلتے گلاب کا پودا یہاں لگایا تھا۔ یا پھر وہ ایک لڑکا، جو اس لڑکی کی تلاش میں تھا۔ جو اس سے ایک سال پہلے گم ہو گئی تھی، اور اس کا عکس اس جلتے گلاب کے اندر دکھائی دے رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

اس آدمی نے خالی گھر میں موجود اپنے سامنے ایک گلاب کے خوبصورت پودے پر کچھ عمل کیا، اور اس گلاب کے اندر سے اس کی خوشبو باہر نکل آئی، وہ گلابی رنگ کا دھواں تھا، جو ہوا میں معلق ہو گیا۔ اس آدمی نے اس خوشبو کو نظروں ہی نظروں میں اپنے تابع کر لیا۔ اور پھر اسے آنکھوں سے اشارہ کر کے باہر گھر سے نکلنے کو



ہنیوں کے لیے ان سے زیادہ پریشان ہے۔

☆.....☆.....☆

وہ لڑکی قبرستان میں کھڑی ہے، اور اچا بھاگ رہی ہے۔ ایک قبر سے انسانی ہاتھ ہے۔ اور اسے پاؤں سے پکڑ لیتا ہے۔ وہ ہے، اور اس ہاتھ سے اپنا پیر چھڑا کر ایک طرف جاتی ہے۔ قبرستان کے پچانک پر ایک خونخو کھڑا ہے دیکھ رہا ہے۔ وہ نیم اندھیرے طرف بھاگ رہی ہے۔ وہ بھڑایا سے پکڑنے جست مار کر اس پر چب لگا ہے۔ اور وہ لڑکی میں وہاں ایک اندھے کنویں میں وہ گرتی ہے۔ وہ بھیڑے کے ٹکٹے میں آنے سے بچ مگر کنویں میں گر جاتی ہے۔ اس کے منہ سے ایک لڑکے کا نام نکلتا ہے۔

☆.....☆.....☆

وہ لڑکا ایک بچے کے ہاتھوں لڑکی کو، پھول اور اپنے دل کی ترجمانی کا خط بھیجوا دیا۔ بچہ جب اس لڑکی کو پھول دینے مگر کے اندر وہ لڑکی سمجھتی ہے، کہ بچے نے اسے پھول دے۔ لے لیتی ہے۔ اور اسے "تھینک یو" کہتی ہے۔ آکر اس لڑکے کو کہتا ہے۔

"وہ تھینک یو کہہ رہی تھی۔" وہ لڑکا بچے کو بازوؤں سے پکڑ کر گول گول گھماتا ہے۔ لمحے مگر کی دیوار سے سارے گلاب کے پھول ہو کر باہر پھینکے جاتے ہیں۔ اس خط کے سینکڑوں کر کے وہ لڑکی دیوار کے پار پھینک دیتی ہے

☆.....☆.....☆

وہ لڑکا ساحل سمندر کنارے کھڑا ہے، اور ان تینوں کو متوجہ کر لیتا ہے۔ وہ آدنی ہے۔ اور اپنے آدمیوں سے کہتا ہے۔ "میرا دھوراکام پورا کرو۔ اس پودے میں برد کرو۔" وہ لوگ جانے لگتے ہیں۔ وہ نکال کر اس آدمی پر تان دیتا ہے۔ مگر وہ

وہ آدمی اپنے آفس میں بے چینی سے بیٹھا ہوا تھا، کچھ دیر بعد ایک الزماؤرنی لڑکی اس کے سامنے آگئی، اور بالکل اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ وہ اس کو دیکھ کر ویٹ پیپر میز پر گھمانا شروع کر دیا۔ وہ آدمی بہت زیادہ پریشان تھا۔ اس کی نگاہوں میں عجیب سی مکاری چھپی ہوئی ہے۔ وہ اس لڑکی سے کچھ کہا، وہ لڑکی اسے دیکھتی، ہنستی اور کچھ باتیں بتاتی رہی، وہ آدمی اسے اپنی بہو بنانا چاہتا ہے، مگر وہ کہتی ہے۔

"جب تمہارا بیٹا ہی مجھے اپنانا نہیں چاہتا ہے تو تمہارے چاہنے یا میرے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔" وہ وہاں سے چلی جاتی ہے۔ وہ پریشان ہو جاتا ہے۔ اور غصے سے ٹھلنا شروع کر دیتا ہے۔

☆.....☆.....☆

رات کے دو بجے، ایک کمرے وہ لڑکی کوے میں پڑی ہوئی ہے۔ اس کے پاس قریب ہی صوفے پر اس کی بہن لیٹی ہے، جو سو رہی ہے، کوئی آدمی کمرے کا بند دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں کلوروفارم سے مبرا ہوا رومال ہے، وہ اس صوفے والی لڑکی کے پاس جاتا ہے، اور رومال اس کے منہ پر رکھ دیتا ہے تو وہ ہوش و خرد سے بیگانہ ہو جاتی ہے۔ اب وہ قدم قدم کوے میں پڑی ہوئی لڑکی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اب وہ اپنے کپڑے اتار رہا ہے۔ اور اس لڑکی کو خمار الود نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ اپنی شرٹ اتارنے کے بعد وہ اس لڑکی کے اوپر جھک جاتا ہے، اور اس کے گردن پر اپنے ہونٹ رکھ دیتا ہے تو لڑکی کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔

☆.....☆.....☆

اس آدمی کے دونوں کم سن بچے اغوا ہو جاتے ہیں، اور اغوا کار اسے اپنی بیٹیوں سمیت شہر چھوڑنے کو کہتے ہیں۔ وہ آدمی پریشان ہو جاتا ہے۔ مگر اپنے بچوں کی خاطر راتوں رات، گاڑی بلوا کر اپنا ضروری سامان سمیٹ کر یہاں سے بہت دور کہیں کوچ کر جاتا ہے۔ اس کی بیٹیاں بہت پریشان ہیں۔ مگر وہ اپنے دونوں

۱۰۰۔ اے گولی چلانے کو کہتا ہے۔ اسی لمحے وہ لڑکا پر ہل کر اس آدمی اور اس کے آدمیوں کے آگے سے روک دینے کو کہتا ہے۔ وہ آدمی نہیں ہٹتا۔ وہ لڑکا اپنے آپ کو گولی مار دیتا ہے۔

☆.....☆.....☆

دلہا اپنی دلہن کے ہاتھ میں پستول دیتا ہے۔ دلہن پستول لے لیتی ہے۔ اور اسے دیکھتی رہتی ہے۔ دلہا سٹراٹا ہے۔ اور دلہن پستول اس کے سینے پر دیتی ہے۔ دلہا کچھ نہیں کہتا ہے۔ دونوں ایک لمحے کے لیے آگے سے ہٹ کر دیکھتے ہیں اور ایک لمحے کے بعد باہر سے آتے ہیں۔ دلہن کچھ دیر بعد باہر آتی ہے۔

☆.....☆.....☆

تین رات کے اس پہر ہائی وے پر اپنی بیوی ایک پریشان ہوا گھر کی طرف کو سفر تھا۔ وہ کئی بار الٹی واپس پر آیا گیا۔ اس کے چہرے پر پریشانی تھی۔ اس کو بالکل بھی سکون نہ ہو۔

مگر اس کو جیسے کسی چیز کی تلاش تھی۔ وہ سکون کے لیے اندر در اندر گھر میں گھومتی تھی۔ وہ اسے ڈھونڈنے کے لیے نکل کر سڑکوں پر تلاش کر رہا تھا۔ یہ بات اس کی زمین کوئی آوارہ نایب لڑکا تھا وہ بالکل ایسا تھا۔ تو ایک اعلیٰ خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ سوسائٹی اس خاندان کا ایک نام تھا۔ لوگ اس خاندان کو کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ بلکہ یہ کہتا ہرگز غلط نہ تھا۔ زمین ابراہار کو بھی لوگ اس خاندان کا فرد کی حیثیت سے ہی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ زمین ابراہار ایک خوش شکل نوجوان تھا۔ وہ بہت تھا۔ اور قدرت نے اس میں ذہانت کو کٹ کوٹ دی تھی۔ اس سب کے علاوہ نہ تو وہ مہمند ڈی اور نہ اس میں ذرا سا بھی تکبر پایا جاتا تھا۔ نہ وہ تھا۔ اس اعلیٰ خاندان سے تعلق کے باوجود وہ ان کی جڑا نہیں تھا۔ اس نے زندگی میں کبھی کسی لڑکی ان نہیں پہنچایا تھا۔ زمین کے ڈیڈ ابراہار احمد ایک

جانے مانے ثانی کون بزنس میں تھے۔ ان کی دولت کا کوئی حساب ہی نہیں تھا۔ اسے بزنس سے سرکھانے کو فرصت نہیں ملتی تھی۔ ابراہار احمد یہ سب کچھ وراثت میں ملا تھا۔ اسی طرح اب یہی سب کچھ زمین کا تھا کیونکہ اسی بینک بیلنس اور دولت کا زمین اکلوتا وارث تھا۔ وہ ایک خوش نصیب نوجوان تھا۔ زمین کی ماں زرتشا احمد ایک سوشل ورکر تھی۔ وہ زیادہ تر اپنے اپنے جی اوز، کے فلاحی کاموں میں مصروف رہتی تھی۔ زمین اگر باپ کا لاڈلا تھا، تو ماں کے کچھنے کی ٹھنڈک بھی تھا۔ زمین اتنی دولت مندی کے باوجود بھی ایک دردمند دل رکھنے والا انسان تھا۔ وہ بنی نوع آدم کی اولاد کو تکلیف میں دیکھ کر سخت تکلیف محسوس کرتا تھا۔ اس لیے وہ بہت زیادہ احساس طبیعت کا مالک تھا۔ اس نے کبھی بھی کسی انسان سے حکم انگیز رویہ اختیار نہیں کیا تھا، وہ ہمیشہ دوسروں کو انسان سمجھ کر بات کیا کرتا تھا۔ اس کا رویہ ہمیشہ ہر ایک سے انتہائی خوش گو اور ہاتھ تھا۔ اور اسی لیے وہ اتنی دولت مند ہونے کے باوجود بھی کسی معاشرتی برائی کا شکار نہیں ہوا تھا۔ وہ خوش قسمت انسان تھا۔ اس پر اللہ کی رحمت کا سایہ تھا۔ ورنہ شیطان تو ہر جگہ بہکانے کے لیے موجود ہوتا ہے۔ ایک سال پہلے زمین کو پونیورسٹی میں سوبائے پیار ہو گیا تھا۔ سوبائے حسین و جمیل لڑکی تھی۔ وہ اتنی خوبصورت تھی۔ جیسے کوئی پری ہو، جو بنا پروں کے پونی میں آگئی تھی۔ سوبائے کو دیکھ کر کئی دل ایک ساتھ دھڑک اٹھے تھے۔ مگر وہ اسے تو جیسے کسی سے کوئی سروکار ہی نہیں تھا۔ سوبائے حسین و جمیل ملکوتی حسن کی مالک تھی۔ اس کی آنکھوں کا رنگ نیلا تھا۔ وہ جیسے کوئی ساحرہ تھی۔ جو آئی اور دیکھتے ہی زمین کو فوج کر گئی۔ اس پر زمین اپنا دل ہار بیٹھا۔ سوبائے چاہے جانے کے قابل تھی۔ واقعی وہ حسن کا مجسمہ تھی۔ بلاشبہ حسین و جمیل خوبصورت ملک کی طرح پیاری، اس کے انداز میں بہت عجیب قسم کی کشش تھی۔

☆.....☆.....☆

دل میں زین کو چاہنے لگی ہو۔ زین اور سوبا نہ صرف ایسے دوست بن گئے تھے۔ بلکہ دونوں میں کمال کی انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی تھی، وہ دونوں بن کے ایک دوسرے کی بات سمجھ لیتے تھے۔ اور ہر موضوع پر ایک دوسرے کے ساتھ بے لاگ تبصرہ اور گفتگو کر سکتے تھے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے خنجر تھے کہ کب کون محبت کے اقرار میں پہل کرتا ہے۔ مگر ابھی دونوں خود سے ایسا کچھ نہیں کرنے والے تھے۔

وہ خوشگوار سے دن تھے اور بڑا ہی سہانا دور تھا۔ یونی میں فاسل آئیر کا ایگریم شروع ہونے والے تھے۔ مگر زین فاسل آئیر کے ایگریم اشارت ہونے سے پہلے پہلے ہی سوبا کو دل کی بات بتانا چاہ رہا تھا۔ ایگریم شروع ہونے میں ابھی اچھا خاصہ وقت باقی تھا۔ ان دنوں زین نے محسوس کیا کہ سوبا کو کوئی پریشانی سی ہے۔ اس کا چہرہ ہر وقت بے رونق سا رہتا اور زین جیسے اس کی دل کی بات جان لیتا تھا۔ وہ ہر وقت ڈرکی سہمی سی رہنے لگی تھی۔ زین اس کو اس حال میں دیکھ کر سخت بے چین ہونے لگتا۔ اس نے اس سے الگ ہو چھا۔ مگر ہر بار سوبا نے ٹال دیا۔ زین اصرار تھا۔ پھولوں کے بستر جیسے جوان ہوا تھا، اس نے یہ کبھی نہ سوچا تھا کہ زندگی پھولوں کے بیج کے ساتھ ساتھ کاٹاؤ بھری ایک طویل شاہراہ کا نام بھی ہے۔ وہ کبھی سوچ نہ نہیں پایا۔ اس نے کبھی کوئی دکھ کہاں دیکھا تھا۔ وہ اپنی زندگی سے خوش اور مطمئن تھا۔ اسے ہر کوئی خوش اور مطمئن لگتا تھا۔

زین کو ان دنوں آرٹ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ بزنس پڑھ رہا تھا۔ وہ اپنے باپ کو اپنا آئیڈل مانتا تھا۔ وہ اس کی زندگی فالو کرنا چاہتا تھا۔ اس کی ٹرڈرلڈ کلاس بزنس مین بننا اس کا بچپن کا سہنا تھا۔ مگر شاید قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ جب وہ سوبا سے نہیں ملا تھا۔ ان دنوں اچانک یونیورسٹی میں گریڈ پارٹی "ویکم" شروع ہو گئی۔ یہ پارٹی ان اسٹوڈنٹس کو دی جا رہی تھی۔ جو جو نیئر رہی کیونکہ اسٹوڈنٹس کا نیا سیشن شروع

سوبا مگر حسین و جمیل مانند پری تھی، تو زین بھی کم نہ تھا۔ وہ بھی شاندار شخصیت کا مالک تھا۔ زین اگر سینکڑوں لوگوں میں بھی کھڑا ہوتا تو نمایاں نظر آ جاتا۔ وہ چھ فٹ قد کاٹ کا مالک تھا۔ وجاہت میں بھرپور، گورا رنگ، بڑی بھرپور ساحرانہ کشش والی جادوئی آنکھوں کا مالک، کندھوں تک سلگی بال ایسے تھے۔ جیسے کہ وہ کسی فلم کا ہیرو ہو۔ زین پر یونیورسٹی کی لڑکیاں فدا ہو گئی تھیں۔ وہ دن رات زین کو اپنی دعاؤں میں مانگا کرتی تھیں۔ وہ ہر دن زین کو دیکھنے کے لیے بے چین ہوئیں۔ اور جب زین ان لڑکیوں کو نظر انداز کر دیتا تو وہ زین کے لیے آہیں بھرا کرتیں۔

زین کا دل تو بس ایک ہی ساحرہ سوبا کے پاس تھا۔ زین نے سوبا کو دیکھتے ہی سوبا پر اپنا دل ہار دیا تھا۔ پوری یونیورسٹی میں ایک واحد دہی لڑکی تھی۔ جس کے گال میں ایک خوبصورت سا ڈیمبل پڑتا تھا۔ نہ صرف سوبا کے دانت موتیوں کی لڑی کی طرح حسین تھے، بلکہ خدا نے اس کو گھنے دلکش صحت مند بالوں سے بھی نواز رکھا تھا۔ وہ ایک ایسی لڑکی تھی۔ جس میں خامی ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی تھی۔ وہ اصول کو دل حسن کی مالک تھی۔ اور سب سے بڑھ کر اس کی سریلی آواز تھی۔ اگر یونیورسٹی کی لڑکیاں زین پر فدا تھیں۔ تو لڑکے سوبا کے لیے بھی آپس ضرور بھرا لیا کرتے تھے۔

سوبا کو ہر ایک نے پسندیدگی کی سند بخشی تھی۔ ہر جگہ پر اسے پزیرائی ملی تھی۔ اگر وہ پزیرائی ہر جگہ اس کی ذہانت، خوبصورتی اور آواز و انداز کی وجہ سے ملتی رہی تھی۔ تو بے جا نہ تھی۔ وہ اسی قابل تھی۔

زین نے بھی اس سے اقرار محبت تو نہیں کیا تھا۔ مگر اس کا دوست ضرور بن گیا تھا۔ اور سوبا نے اس کی دوستی کا ہاتھ قبول کر لیا تھا۔ وہ بھی ایک اچھا سا دوست چاہتی تھی۔ زین کی تعریف سب کرتے تھے، اسے زین کی تعریف سن کر اچھا لگتا تھا۔ سوبا کا دل زین کے ساتھ بڑا خوش رہتا تھا۔ جیسے وہ بھی دل ہی

سوا ایک قابل محنتی، اور ذہن لڑکی تھی۔ وہ بھی اسی یونی میں پڑھنے کے لیے آئی ہوئی تھی۔ وہ کوئی اپسرا تھی۔ جو بے انتہا خوبصورت تھی۔ ان دنوں وہ ایک دوسرے سے نہیں ملے تھے۔

پارٹی شروع ہوئی۔ اسٹیج پر اناؤسمٹ ہونے لگی۔ ہال روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ پوری یونی کے لڑکے لڑکیاں ہال میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ زین آگے بیٹھا ہوا چمک رہا تھا۔

وہ بے حد خوش تھا۔ اب نئے طلباء کو کوئی ویکلم کرنے کے لیے آ رہا تھا۔ اور انہیں بار بار ان طلباء کی مثالیں دی جا رہی تھیں۔ جو اس یونی سے فارغ تحصیل ہو کر بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ زین ان باتوں سے سخت پوری ت محسوس کر رہا تھا۔ اس کے بعد کچھ طلباء میں انعامی شیلڈ تقسیم کرنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان سب سے زین پور ہو گیا تھا۔

اچانک اسٹیج پر ماڈلنگ کا سلسلہ شروع ہو گیا، یونی کے طلباء نے اس میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ زین کو اب پارٹی میں کچھ رونق محسوس ہونے لگی تھی۔ ماڈلنگ کے بعد ڈانس کا سلسلہ چل نکلا۔ انڈین بے ہودہ گانوں پر گرلز اور بوائز نے خوب کمر ہلائی۔ ایک لڑکی سب سے زیادہ لنگے جھٹکے مار رہی تھی۔ وہ سب سے اچھا ڈانس پیش کر رہی تھی۔ زین نے اس لڑکی کو غور سے دیکھا۔ وہ اس کے ڈیڈ کے دوست کی بیٹی تھی۔ وہ جب بھی اس سے عام زندگی میں ملتا تھا۔ وہ لڑکی شرافت کا نمونہ بن کر ملی تھی۔ مگر یہاں تو وہ بنادو پنے کے سب کے سامنے سر عام کھلے ناچ رہی تھی۔ اور ایسے لنگ جھٹک کر جموم رہی تھی کہ کیا ہی انڈین اداکارئیں کرتی ہوں گی۔ آج کل کا پاپولر گانا، زین کے سماعت میں گونج رہا تھا۔

”ماہ نور جبین.....!! آئی کانت بلیووس۔ یہ تم ہی ہوتا۔“ زین نے ماہ نور پر دونوں آنکھیں مرکوز کر کے خود سے کہا۔ ماہ نور جبین انڈین فلموں کی دلدادہ اور میک اپ کی پروردہ نئے دور کی لڑکی تھی۔ مگر اس سے پہلے اس

نیا تھا۔ سوا تو بزنس نہیں پڑھ رہی تھی، وہ جرنلزم کے ایڈیٹر سے ایک عام سی ڈگری کے لیے یہاں آئی تھی۔ اور قدرت نے اسے زین سے ملایا تھا۔ اتنی بڑی ہالی میں وہ زین سے ملی، ان دنوں کے ڈیپارٹمنٹ الگ تھے۔ اور جیکٹ کے حساب سے دونوں کی ٹائمنگ اپنائی الگ تھی۔ دونوں کے کمپاؤنڈ بھی بہت دور تھے۔ مگر ہر کسی وہ مل گئے۔ تو یہ ان دنوں کے لیے قدرت کا تحفہ تھا۔ سوا اور زین کی پہلی ملاقات بڑی فلمی انداز سے ہوئی تھی۔ زین سوا کو جانتا تک نہیں تھا۔

وہ نیا نیا یونی میں آیا تھا جو میر تھا۔ 20 سال کی تھی۔ اس نے کوئی معاشرتی برائی نہیں اپنائی تھی۔ اس نے بھی زندگی میں بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ بزنس پڑھتے وقت محبت کا شکار ہو جائے گا۔

گنتی لڑکیاں اس کی دلکش بڑی ساحرانہ آنکھوں کی دھواں تھیں۔ وہ یہ بات اچھی طرح سے جانتا تھا۔ اور ہمیشہ یہ بات سمجھتا بھی تھا۔ مگر وہ یہاں کسی لڑکی پر برے منے نہیں آیا تھا۔ دوسری اہم بات یہ تھی کہ اس نے ماں باپ نے اس کو لڑکیوں سے دور دور رہنے کی تلقین کی تھی۔ وہ ماں باپ کی بات نہیں نال سکتا تھا۔ اس نے یہ بات جیسے گروہ میں باندھ لی تھی۔ وہ لڑکیوں سے بے اثر بلکہ ہو گیا تھا۔

اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ محبت کرے گا۔ یا اپنی خوابوں کی اس لڑکی کو دیکھے گا۔ جو اسے ہاں اس مقام پر ملے گی۔ جس کے سامنے وہ اپنا دل ادا جائے گا۔ اور وہ ہر وعدہ بھلا دے گا۔ جو اپنے ماں باپ سے کر بیٹھا تھا۔

☆.....☆.....☆

جونیر کے لیے سینئر (ویکلم) پارٹی کر رہے تھے۔ ان دنوں سے یونی میں ہلاک بگڑ چا ہوا تھا۔ یہ کوئی عامی ورلڈ یونی نہیں تھی۔ اس میں امیر و کبیر خاندانوں نے اپنے بچے پڑھتے تھے۔ اور زین بھی اسی کا اسٹوڈنٹ تھا۔ اس لیے اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ یہاں کوئی لڑکا یا لڑکی پڑھنے کے لیے آئے ہونگے۔

ہوں کہ وہ آئے اور اپنا کھالیر کس خود کا کر سائے جیسے کہ میں نے اس سے پہلے بھی سوا کے بارے بتایا ہے، کہ وہ ایک ہونہار اور قابلِ خلقی لڑکی ہے۔ ایک سریلی آواز کی بھی مالک ہے، اور مجھے یقین ہے جب آپ اس کے لکھے اور اس کی آواز کو سنیں گے ضرور اس کو پسند کرنے لگ جائیں گے۔ سوا جب اپنی آواز میں بات کرتی ہے تو بالکل ایسا لگتا ہے جیسے وقت ختم سا مگیا ہو پھول برس رہے ہو، ہوا میں ٹھنڈا مگنی ہوں، میرا ماننا ہے کہ اگر اس کو سن لیں، تو لوگ کی آواز کے دیوانے بن جائیں۔ کیونکہ وہ جب بات کرتی ہے تو سننے والا کھڑا سمجھتا ہے ششدر سا کھڑا جاتا ہے۔“ مہمِ رخشندہ کی باتوں کے دوران ہی آکر والے اشج پر آ گئے تھے۔

زین کو مہم کی باتیں سن کر حیرت ہو رہی تھی جیسے مہمِ رخشندہ کسی لڑکی کی تعریف نہیں اپنی تعریف رہی ہوں۔ وہ حیرت سے مہم کو دیکھ رہا تھا۔ جواب سے اتر رہی تھی۔ اور اسے بالکل بھی یقین نہیں آ رہا اُسے کیسے کسی ان دیکھی حسینہ کی سنی سنائی تعریف اور یقین آ جاتا۔ ابھی وہ یہ سب سوچ ہی رہا تھا۔ سفید لباس میں اجلی، وہ لڑکی بیک اشج نمودار ہو گئی۔ اس نے پتک کھڑا دوپٹہ کندھے پر رکھا تھا۔ وہ اس لباس میں آسانی حور لگ رہی سب کی نظریں اس پر انک کر رہ گئیں۔ زین نے بجائی۔ تو سب کی محویت ٹوٹ گئی۔ سب لوگ تا بجانے لگ گئے۔ زین اس کو دیکھ کر حیرت سے کہہ گیا۔ وہ مسکرا رہی تھی، اس کے دائیں گال میر ذہیل پر رہا تھا۔ زین حیرت سے کھڑا کا کھڑا زین کو فوراً کسی نے ہاتھ سے کھینچ کر بٹھا دیا۔ کیونکہ رو میں بیٹھے ہوئے لڑکی کو سوا نظر آتا بند ہو جاتی تھی۔ بیٹھ گیا۔

وہ اب بایک ہاتھ میں لیے کھڑی تھی۔ اور ایک ننگ سوا کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا دل اس کے گم ذہیل میں کہیں گم ہو گیا تھا۔ جیسے پہلی ہی نظر میں وہ

نے جب بھی کبھی ماہ نور کو دیکھا تھا۔ وہ تو انتہائی سہیل سی ہوتی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس کا دل بہت خراب ہوا۔ وہ پارٹی سے جانے کا سوچ رہا تھا۔ وہ واحد شخص تھا جو اتنی رنگینی میں بھی بور ہو رہا تھا۔ اس کا اپنا ایک الگ انداز تھا۔ زین پارٹی سے نکلنے کا سوچنے لگا۔ اس نے ہاتھ میں باندھی کھڑی کی طرف دیکھا۔ ماہ نور کا ڈانس ختم ہو چکا تھا۔ اسی لمحے جرنلزم ڈیپارٹمنٹ کی مہمِ رخشندہ عرف رشی آ گئیں۔ انہوں نے بایک سنبھال لیا۔ مہمِ رخشندہ ایک کامیاب جرنلسٹ بھی تھیں۔ انہوں نے دلوں کو چھونے والے کئی خوبصورت پروگرامز کیے تھے۔ ان کی آواز کانوں میں گھس گھسیتی تھی۔ جیسے کسی کوئل کی شیریں آواز۔

”سب سے پہلے تو آپ سب کی بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ سب نے اس تقریب کو کامیاب بنانے کے لیے میرا بھرپور ساتھ دیا۔“ ایک دم سے پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

”آپ لوگوں نے دل سے شرکت کر کے میرا مان بڑھا دیا۔ میں اب ایک بالکل فریش طالبہ کو دعوت دینا چاہتی ہوں کہ وہ آئے اور اپنی سریلی آواز میں گانا گائے۔“ ایک بار پھر سے پورا ہال تالیوں کی گونج سے جھنجھکا۔

”میں آپ سب کو سوا کے بارے میں کچھ باتیں بتانا چاہتی ہوں۔ نئے دور کی یہ لڑکی ایک اچھی شاعرہ بھی ہے۔ یہ صرف گانے سمجھتی ہے۔ گانے سے مطلب ہے کہ لیر کس یہ ایک اچھی لیر کس رائٹر بن سکتی ہے۔ اس نے کبھی کسی کے لیے تہج تک کوئی گانا نہیں لکھا ہے۔ مگر یہ اپنے لیے لیر کس لکھتی ہے۔ اس کے لکھے گانے انٹر نیٹس لیول کے ہیں۔ اور جب اس نے مجھے اپنی شاعری دکھائی۔ تو میں اتنی متاثر ہوئی اور سوچا کہ آپ سب کو کبھی اس کی شاعری سنا دو۔“ ایک بار پھر ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

”اب میں جرنلزم ڈیپارٹمنٹ کی ہونہار اور لائق فائق پیاری من مہنی سوا کو دعوت دینا چاہتی



ابن اُڈا کر لئے گئی تھی۔

ری تھی مگر زین پر سکون تھا۔ وہ سو با کو دیکھ کر اس کا دیوانہ

بن رہا تھا۔

جلتا گلاب سا میرا وجود ہے  
دل میرا جل رہا ایسا ثبوت ہے  
کیسے ستم ہوئے پیار کی راہوں میں  
بن تیرے محل رہے تیرے ہی ہاتھوں میں  
پھر بھی قرار رہے تیرا یہ پیار ہے  
تیرے نگاہ میں ہے میرا خدار ہے  
گانا گاتے ہوئے سو بانے ایک دم زین کی  
طرف دیکھا، دونوں کی نگاہیں مل گئیں۔ زین کو ان  
نگاہوں سے تشک کا احساس اپنے دل پر محسوس ہونے  
لگا۔ وہ ایک ننگ سو با کو ہی دیکھ رہا تھا۔ سو با کا دل دھڑک  
اٹھا۔ مگر وہ سو با پر فارغ نہ ہوئی تھی۔ جلد ہی لمحوں میں  
سنبھل گئی۔ اس نے دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔  
مگر زین ایسا نہ کر سکا۔ اب سو با کو آخری بند گانا تھا۔

یہ جو گلاب ہے میرا شباب ہے  
حسن مانتا ہے کیا حساب ہے  
جلتا گلاب سا میرا نصیب ہے  
نہ سے کیوں دور ہو کوئی رقیب ہے  
لوگ پہلے گانے کے پہلے ہی بند میں تالیاں  
ہانے لگ گئے، واقعی اس کی آواز نے جیسا جادو کر دیا  
تھا۔ پھر لوگ سربھی موسیقی کی دھن پر ہلانے لگ گئے۔  
جلتا گلاب ہے پہلے ہی پیار میں  
دل میرا جل رہا تیرے خدار میں  
تیرا جو پیار ہے دل کا قرار ہے  
ہر لمحہ تیرے ہی مار میں  
مل جاؤ تم مجھے یار اس پیار میں  
ورنہ مٹ جاؤں گی یار یوں غدار میں  
واقعی میم رخشدہ نے بالکل سہی کہا تھا۔ وہ تو اصلی  
اور ہیرا تھا۔ اس نے موسیقی کے لے پر اتنی پرفیکٹ  
نغمہ کی تھی۔ حاضرین محفل کو جھوٹے پر مجبور کر دیا  
تھا۔ اس ہکے بعد کچھ دیر موسیقی بجتی رہی۔ اور سو بانے  
اب ٹھٹھٹھ کا شروع کرنا تھا۔ اس کی آواز نے لوگوں کو  
خست کر دیا تھا۔ موسیقی کی آواز ہال میں بنگامہ برپا کر

”سب سے پہلے تو میں میم رخشدہ کی بے حد شکر  
نثار ہوں۔ جس نے آج مجھے اتنی عزت دی کہ میں  
ہال نہیں کر سکتی۔“ زین کو گلے لگا کر ہر طرف سے پھول  
نی پھولی گر رہے ہوں۔ میم رخشدہ نے جھوٹ نہیں بولا  
تھا۔ وہ سب سچ تھا۔ لوگ زور زور سے تالیاں بجانے  
لگے۔ اب گہری خاموشی چھا گئی۔ اسٹیج کی تمام  
ریشیاں سو با پر فوکس ہو گئیں۔ ہال نیم تاریکی میں  
اب کیا۔ آکر سزا والے دھیمے دھنوں میں دھن بجانے  
شروع ہو گئے۔ اس وقت سب کی نظریں سو با پر لگی ہوئی  
تھیں۔ سو با پرستان کی وہ پری لگ رہی تھی، جس نے  
اپنے پر لکھن پر تم کر دیے ہوں۔ خوبصورت سی موسیقی  
نے لے لے پر اس نے لب کھول دیے۔

”جلتا گلاب“.....!! ہال میں سنا سنا چھا گیا۔  
یہ جو گلاب ہے تیرا شباب ہے  
حسن مانتا ہے کیا حساب ہے  
جلتا گلاب سا میرا نصیب ہے  
نہ سے کیوں دور ہو کوئی رقیب ہے  
لوگ پہلے گانے کے پہلے ہی بند میں تالیاں  
ہانے لگ گئے، واقعی اس کی آواز نے جیسا جادو کر دیا  
تھا۔ پھر لوگ سربھی موسیقی کی دھن پر ہلانے لگ گئے۔  
جلتا گلاب ہے پہلے ہی پیار میں  
دل میرا جل رہا تیرے خدار میں  
تیرا جو پیار ہے دل کا قرار ہے  
ہر لمحہ تیرے ہی مار میں  
مل جاؤ تم مجھے یار اس پیار میں  
ورنہ مٹ جاؤں گی یار یوں غدار میں  
واقعی میم رخشدہ نے بالکل سہی کہا تھا۔ وہ تو اصلی  
اور ہیرا تھا۔ اس نے موسیقی کے لے پر اتنی پرفیکٹ  
نغمہ کی تھی۔ حاضرین محفل کو جھوٹے پر مجبور کر دیا  
تھا۔ اس ہکے بعد کچھ دیر موسیقی بجتی رہی۔ اور سو بانے  
اب ٹھٹھٹھ کا شروع کرنا تھا۔ اس کی آواز نے لوگوں کو  
خست کر دیا تھا۔ موسیقی کی آواز ہال میں بنگامہ برپا کر

اختتام پر زین نے میم رخشندہ سے بات کر کے سوہا کے بارے میں کافی معلومات حاصل کر لی۔ میم رخشندہ نے اس کو سوہا کے بارے میں کافی کچھ بتایا۔

☆.....☆.....☆

سوہا کو لڑکوں میں کوئی دلچسپی تو نہیں تھی، مگر زین کو قطعاً نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ وہ بھی تو سب میں نمایاں نظر آتا تھا۔ اور سوہا کو اچھا بھی لگتا تھا۔ یوں چند دنوں کی ملاقاتوں میں دونوں بہت اچھے دوست بن گئے۔ دونوں کی دوستی میں میم رختی نے بھی خوب کردار نبھایا تھا۔ وہ ایک دوسرے کے بے حد احترام کرتے تھے۔ ہر معاملے کو ایک دوسرے سے خوب ڈسکس کرتے، وہ ایک دوسرے کی رائے لینے لگے، وہ فارغ وقت میں ہمیشہ ساتھ پائے جانے لگے۔ یونی کے زیادہ تر لوگوں کو نکلنے لگا، کہ زین اور سوہا کے درمیان کوئی کسمپرسی چل رہی ہے۔ یہ غلط بھی نہ تھا۔

زین نے اس عرصے میں بھی سوہا سے محبت کی کوئی بات تو نہیں کی تھی۔ مگر اس کے ہر انداز سے محبت کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ زین کو حیرت ہوتی تھی، کہ سوہا اس کا انداز محبت کیوں نظر انداز کر رہی ہے۔ اور سوہا نے زین سے ہر معاملے پر اور ہر موضوع پر زیر بحث تبصرہ کیا تھا۔ مگر کبھی اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں اسے کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔ زین نے کئی بار پوچھا۔ مگر ہر بار اس نے ٹال دیا۔ زین نے بھی زیادہ کرید نہیں۔ حالانکہ اس کو سوہا کے بارے میں سب سے زیادہ جانتا تھا۔ مگر سوہا نے جیسے سب کچھ وقت کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔ ان کی دوستی کافی عرصے رہی۔ اور پھر ایک دن یونی میں ”دی بائے بائے اسٹوڈنٹس“ پارٹی کا آغاز ہو گیا۔ فاضل آئیر کے انگریز شروع ہو گئے۔ زین بہت زیادہ خوش تھا۔ وہ سوہا کو انگریز کے بعد اپنے دل کی ہر ایک بات بتا دیتا چاہتا تھا کیونکہ وہ دونوں یونی سے فارغ ہونے والے تھے۔ یہ ڈیڑھ سال تو جیسے آنکھ جھپکنے ہی گزر گیا تھا۔ اس سے پہلے انگریز اشارت ہوتے، اور نئی تقریب ہوتی۔ سوہا

کا ارادہ اس پارٹی میں اپنے لکھے نئے لیرس گانے کہ اچانک سوہا غائب ہوئی۔ اس کا پورا خاندان ان دم سے گم ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

زین کو حیرت ہوئی، اسے سوہا سے یہ امید تھی۔ ان دونوں کا لمبے عرصے کا ساتھ تھا۔ سوہا فاضل آئیر کا انگریز بھی نہیں دیا۔ زین نے اس کو ڈھمکا شروع کر دیا۔ جس علاقے میں سوہا رہتی تھی۔ اسے کرزین کو یقین کرنا مشکل ہو گیا۔ ایسے گھروں میں زین کے ملازم بھی نہیں رہتے تھے۔ وہ ایک پس ماندہ علاقہ تھا۔ مگر اس میں اسے بہت مشکل پیش آئی۔ اسے سوہا کا گھر ملا، تو اس پر ایک بہت بڑا تالا اس کا چڑا رہا تھا۔ وہ حیرت سے جیسے پاگل ہونے لگا۔ اس نے آس پاس کے لوگوں سے پوچھ پچھ کی، تو یہ چلا۔ لوگ راتوں رات پتہ نہیں کہیں چلے گئے ہیں، کسی ان کے بارے میں پتہ نہیں تھا۔ زین نے بالکل طرح اس علاقے کے لوگوں سے کئی بار پوچھا۔ مگر ان کاظم تھے۔ جیسے وہ لوگ زمین میں جھنس گئے ہو۔

زین کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ایسا کیا ہو گیا کہ سوہا اور اس کی فیملی ایک دم سے سب کچھ چھوڑ کر گئے ہیں۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ سوہا ایسے گم ہو ہے۔ وہ سوچ سوچ کر پاگل ہو گیا۔ وہ سمجھتا آیا تھا سوہا بھی اس کی طرح ایک امیر و کبیر خاندان سے رکھتی ہے۔ مگر اب جو حقیقت اس کو پتہ چلی تو اس اسے بے حد دکھی کر دیا۔ سوہا کے لباس اور انداز یہ کبھی نہیں لگا تھا کہ وہ ایسے پس ماندہ گھرانے سے رکھتی ہے۔ وہ ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

”سوہا تم نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟“ گم ہو گئی ہو؟ کہاں چلی گئی ہو؟ کس وجہ سے چلا ہو؟“ وہ خود سے پوچھتا۔ مگر اس کے پاس کوئی نہیں تھا۔ وہ وہاں سے چلا آیا۔ وہ بہت دل برداشتہ مگر وہ سال ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے انگریز مدد دے دیے۔ مگر وہ سوہا کو بھلا نہیں پاتا تھا۔

ہوتے جو شعلوں کے لپیٹ میں جل رہے ہوتے تھے۔ اور جب وہ گلاب کے پھولوں کے پاس جاتا۔ تو گلاب کے پھولوں میں سوہا کا چہرہ نظر آ جاتا تھا۔ وہ سوہا کو گلاب کے پھولوں میں جلتا ہوا دیکھتا تو چیخ مار کر اٹھ جاتا۔ وہ پسینہ پسینہ ہوتا۔ اس کا سارا جسم کانپ جاتا۔ وہ سوہا کے لیے دل سے دعائیں مانگنے لگ جاتا۔

اس عرصے میں سال بیت گیا۔ زین نے بہت شاندار راز فہرہز حاصل کیے تھے۔ نیا سال نئی خوشیاں نئی امیدیں لایا تھا۔ مگر زین کو کچھ خوشی نہیں تھی۔ اس نے اپنے ماں باپ کے کہنے کے باوجود اپنی ڈگری کی خوشی سلیمیریٹ نہیں کی۔ وہ اداس تھا تو اسے پوری دنیا اداس نظر آتی تھی۔ اس کو لگتا تھا جسے اس سے کچھ کم ہو گیا ہے۔ وہ اس کی کو مکمل کرنا چاہتا تھا۔ مگر اس کی سمجھ سے یہ سب باہر تھا۔

☆.....☆.....☆

ابراہم نے زین کو نئے سال پر باہر بھجوا دیا۔ مگر یہاں کی رنگینیوں میں اس کا دل بالکل بھی نہ لگ سکا، اس کو سوہا سے محبت تھی۔ وہ اسی ملک میں تھی جس کو وہ چھوڑ کر آیا تھا۔ اس لیے وہ واپس چلا آیا۔ وہ سوہا کو کیسے چھوڑ کر یہاں سکون سے رہ سکتا تھا۔ اس نے چند دن گزارے مگر ایک رات اس نے پھر وہی جلتے گلاب کا خواب دیکھا۔ وہ اس رات سو نہ پایا۔ کافی دیر تک روتا رہا۔ وہ رونے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کو اس کے خواب تکلیف دیتے تھے۔ اسے ان خوابوں کی تعبیر ڈھونڈنی تھی۔ مگر وہ بہت ڈرتا تھا کہ کہیں سوہا.....

اس نے راتوں کو اٹھ اٹھ کر سوہا کی آئی ڈی کو دیکھا جلیا۔ مگر جب سے سوہا گم ہوئی تھی۔ اس کی آئی ڈی بند تھی۔ اس کا موبائل نمبر بند تھا۔ زین کا ہر ایک رابطہ اس سے ختم ہو گیا تھا۔ اس لیے ماں باپ کی بے پناہ مخالفت کے باوجود وہ واپس پاکستان چلا آیا۔ اور اس نے پاکستانی ٹی وی ڈراموں میں کام کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے ماں باپ دونوں نے اس کی اس پر بے حد مخالفت کی۔ مگر وہ نہ مانا۔ وہ سوچ چکا تھا۔ اس کا ماننا تھا

رے نوٹ رہا تھا۔ اس کا دل بے حد پریشان تھا۔ وہ دن رات سوہا کے فکر میں بالکان ہوتا رہا۔ اس نے سوہا کو راتوں کو اٹھ اٹھ کر ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ کئی بار اس کے گھر گیا۔ وہ اسی طرح بند تھا۔ وہ کئی بار گیا۔ لوگ بھی اب اسے پہچاننے لگے تھے۔

”سوہا.....!! اگر تمہیں کوئی پریشانی تھی، تو ایک بار تو بتا دیتی۔ میں تمہاری ہر مشکل حل کر دیتا۔ تم نے ہانے سے نقل مجھے بتاتا بھی گوارا نہ کیا۔ کیا تم میرے انداز سے بھی میرے دل کا حال جان نہ پائی۔ کیا مجھے جذبوں میں کوئی کھوٹ تھی۔ جو تم نے میرے ساتھ ایسا کیا۔“ اس کے ساتھ پونی کے کافی سارے انوائس بھی پریشان تھے۔ پروفیسر زبھی کافی حیرت کا شکار تھے کہ ایک دم سے سوہا کہاں گم ہو گئی ہے۔ مگر ان والدین کا جواب کسی کے پاس بھی نہیں تھا۔ لوگ اب روز سوہا کو بلانے لگے تھے۔ مگر ایک لمحے کے لیے بھی سوہا کو زین بلانہ پایا۔ وہ دن رات ہر جگہ بس سوہا کو اسنڈ رہا تھا۔

وہ جب کبھی سو جاتا۔ تو اسے خواب میں جلتے گلاب نظر آتے تھے۔ وہ دیکھتا کہ جلتے گلاب کا کوئی پودا ہے۔ جو کہ آگ کی لپیٹ میں ہے۔

وہ پریشان ہو کر اٹھ جاتا۔ وہ بے حد پریشان تھا۔ اس کی زندگی دھیرے دھیرے جیسے ایک عذاب بن رہی تھی۔ اس نے راتوں کو جیسے سونا چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ پونی سے فارغ تھا۔ اس نے دی بائے بائے انوائس پارٹی میں شرکت نہیں کی۔ وہ جیسے پاگل بننے والا تھا۔ اس کا چہرہ باہر سے بہت پرسکون نظر آتا تھا۔ مگر اس کے اندر ایک لاوا ابل رہا تھا۔ وہ زندگی سے بے مایوس ہو رہا تھا۔ وہ موت کی طرح خاموش تمنائی بیٹھا تھا۔ کیونکہ اس کے اندر نوٹ پھوٹ ہو رہی تھی۔

وقت کے ساتھ ساتھ اس کے خوابوں میں بھی اضافہ ہو گیا۔ وہ خواب میں جلتے ہوئے گلاب کا پودا لگا گلاب کے پودے میں تین گلاب کے پھول

کہ شاید سوہا اسے اس طریقے سے مل جائے۔ اس نے پہلے پہلے کسرٹلز و ماڈلنگ شروع کر دی۔ پھر وہ ٹی وی ڈراموں کی طرف چلا آیا۔ اس کی ایکٹنگ لاجواب تھی۔ لوگوں نے ایک قابل ایکٹر کے طور پر اسے قبول کر لیا۔ ٹی وی ڈراموں کا وہ نامور ہیرو بن گیا۔ اداکاری میں اسے سکون ملنے لگا۔ وہ دھیرے دھیرے اپنے سنجیدہ اور رونے دلانے والے کرداروں سے بے حد مشہور ہو گیا۔ وہ ہر ٹریجڈک رول میں فٹ ہو جاتا۔ اس نے ہر اس کردار کا انتخاب کیا۔ جس سے دوسرے میل ایکٹرز ڈرتے تھے۔ کہ کہیں ایسے ٹریجڈک کریکٹر ان پر ٹریجڈی کی چھاپ نہ ڈالیں۔ اور جب اس کے ڈرامے عوام میں مقبول ہو گئے تو ہر اس ایکٹر کو افسوس ہوا۔ جنہوں نے یہ کردار جیکٹ کیے تھے۔

چند مہینوں میں اس نے خود کو بہت مصروف کر لیا تھا۔ وہ اپنی زندگی سے فرار چاہتا تھا۔ کئی کواکٹر میسر اس کی بھرپور وجاہت پر بری طرح فدا ہو گئی تھیں۔ مگر اس نے کسی کو بھی یہ جھانسنہ نہیں دیا۔ وہ محبت و دھونڈ رہا تھا۔ اسے کسی سے دوبارہ سوہا جیسی محبت ہوتی نہیں سکتی تھی۔ وہ دوسری محبت کا قائل نہیں تھا۔

وہ بہت زیادہ مشہور ہو گیا تھا۔ اس کے دل میں محبت کا غمناک دیا ابھی تک بجھنے نہ پایا تھا کہ اس کی کواکٹر رمشال شاہ نے اس پر ڈور سے ڈالنے شروع کر دیے۔ مگر وہ اس میں بری طرح سے ناکام ہو گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ رمشال شاہ جو اس کی بہترین دوست ہے۔ اس پر مڑی ہے۔ اس نے رمشال شاہ کو کچھ نہ کہا۔ اور اس کے ساتھ اپنے ڈراما کی شوٹنگ کرتا رہا۔ وہ اس فیر میں کوئی نیوٹنیں چاہتا تھا۔

شروع میں تو زرتاشہ اور ابرار زین سے ناراض رہے، مگر جب ہر جگہ سے اُسے کو فیم اور پیسے ملنے لگے۔ تو ان دونوں نے زین کو معاف کر دیا۔ اور سب کچھ پہلے سے بہتر ہو گیا۔ زرتاشہ تو ناراض تھی ہی نہیں، مگر اس نے شوہر کو پیٹنے پر ترجیح دی تھی۔ وہ ابرار کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔ زرتاشہ کی کوششوں سے ہی

ابرار مان گئے تھے۔ ان چند مہینوں میں اس نے وہ کم بنائی، جو لوگ سالوں میں نہیں بنا سکتے ہیں۔ اسے لمبے پیسے عزت سب کچھ ملا، مگر سوہا نہ مل سکی۔ اسے ابھی کم سوہا کا انتظار تھا۔

ابرار احمد اور زرتاشہ زین کے پیچھے پڑ گئے۔ وہ ۱۱ کی کسی اعلیٰ خاندان میں شادی کرانا چاہتے تھے۔ مگر زین نے صاف انکار کر دیا تھا، وہ شادی کے بارے میں ۱۲ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے ان دونوں کو صاف لفظوں میں انکار کر دیا۔ وہ ان دونوں کو کوئی لارا نہیں دیتا چاہتا تھا۔ زرتاشہ تلملائی مگر ابرار نے کچھ نہ کہا۔ اس نے دونوں کو کدھڑا چکا دیے۔ وہ فرانس میں تھا۔ کچھ سوچ رہا تھا۔ اس لیے زرتاشہ نے کچھ نہ کہا۔ مگر وہ جلد از جا یہ کام کر دینا چاہتی تھی، کیونکہ وہ مزید اس معاملے میں دیر بالکل بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

زین نے انکار کر دیا۔ ایک دن اس کے گھر ۱۱ کے ڈیڈ کے دوست کی بیٹی ماہ نور جبین آئی ہوئی تھی۔ بھی زین کو دل سے پسند کرتی تھی۔ اس لیے تو اکثر بلائے یہاں موجود ہوتی تھی۔ وہ سیدھا انکل آئی۔ ملنے کے بعد زین کے کمرے میں آ گئی۔

”ہیلو“.....!! اس نے بنا نوک کیے کمرے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئی۔ زین کو دیکھ کر وہ نو حیرت سے اسے دیکھے چلی گئی۔ زین نے کوئی شر نہیں پہنی تھی۔ اس نے صرف پینٹ پہن رکھی تھی۔ زین اسے دیکھ کر حیرت سے مڑا۔ مگر وہ اوپری ڈھڑکے عریاں تھا۔ اب اس کی چوڑی پینٹ ماہ نور جبین کی طرف تھی۔ وہ درویشی خیم کا مالک تھا۔

”تم.....!! بندے میں کچھ تو تیز ہونی چاہیے۔ فوراً باہر جاؤ“۔ زین نے مڑے ہنسی کہہ دیا۔

”اب دیکھ تو لیا ہے۔ کیوں باہر بھیج رہے ہو؟“۔ نو جبین آج کی لڑکی تھی۔ ایلٹ کلاس کی رول ماڈل تھی۔ ”میں نے کپڑے تبدیل کرنے ہیں“۔ زین۔ فوراً وضاحت دی۔ حالانکہ اس کا دل بے چین ہو رہا تھا۔ ”اچھا۔۔۔!! پکین لوشرٹ.....!! میں نم۔

”زین.....! زین.....! وہ اس کے پیچھے کمرے سے نکل آئی۔ مگر زین اس کی آوازیں ان سنی کرتا ہوا گیراج میں چلا آیا۔

”زین.....! تم جھوٹ بول رہے ہو۔ تمہاری زندگی میں کوئی بھی نہیں ہے۔“ وہ اس کے پیچھے گیراج تک چلی آئی۔

”تم اپنا دل خوش کرنے کے لیے ایسا کہہ رہی ہو۔ ورنہ میرے دل کو دیکھ کر قطعاً ایسا نہ کہتی۔“ زین نے اسے مڑ کر دیکھا۔

”نہیں.....! سب سمجھتے تھے کہ تمہارا اور رمشاں شاہ کا چکر چل رہا ہے، مگر جب سے تم نے پریس میں بتایا ہے کہ ایسا کچھ نہیں ہے۔ تب سے رمشاں شاہ نے بھی خاموشی توڑ دی ہے۔ اس نے بھی اس خبر کو بے بنیاد قرار دیا ہے۔“

”تو.....! اس میں تم کہاں سے والڈ ہونے لگی۔ تم ڈیڈ کے دوست کی بیٹی ہو۔ اس لیے میں تمہارا لحاظ کر رہا ہوں۔ ورنہ میں اپنے پرنس لائف پر کسی کی تنقید برداشت نہیں کر سکتا۔“

”زین.....! میری طرف دیکھو، مجھ میں کیا کمی ہے میں تم سے بے حد محبت کرتی ہوں۔ دیکھو.....!! میری ان آنکھوں میں ان میں تمہارا ہی بسیرہ ہوگا۔ میں تمہیں دل سے چاہتی ہوں۔ میں زندگی بھر تمہارے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنا چاہتی ہوں۔“ ماہ نور نے زین کی آنکھوں میں ڈھٹائی سے دیکھا۔ وہ آج آریا پار کرنے آئی تھی۔

”دیکھو.....! ماہ نور تم ایک اچھی لڑکی ہو۔ اس لیے یہ ڈائلاگ بازی بند کر دو۔ اور اگر تم بھی میری طرح ایکٹنگ کا شوق رکھتی ہو۔ تو میں تمہیں کسی اچھے ڈائریکٹر سے ملوا سکتا ہوں۔ تمہاری صلاحیت میں وہی ڈائریکٹر نکھار لائے گا۔“ زین نے اس کی بات کی زرا سی بھی پرواہ نہ کی۔

”مجھے یہ ہے تم ایسے ہی بورڈ، دوسروں کی پرواہ نہ کرنے والے، مگر میں تمہیں دل سے چاہتی ہوں۔ میں

ملنے آئی ہوں، مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔“ ماہ نور نے جلدی سے کہا۔ زین نے جلدی سے شرٹ مائن لی۔ ماہ نور ایک آنکھ سے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ ماہ نور کی آنکھوں میں چمک تھی۔

”اب بولو.....! کیا بات کرنی ہے؟“ زین اور اہمسی سے بولا۔ اسے ماہ نور جین کی کہنی پسند نہیں تھی۔

”میں نے تمہاری وہ نئے سال پر بنی ٹیلی فلم دیکھی، قسم سے مجھے اتنی اچھی لگی کہ میں بتا نہیں سکتی۔“ ماہ نور نے اس کی تعریف شروع کر دی۔ اور زین کو اپنی ٹھہریوں سے سخت چڑھتی تھی۔

”اچھا وہ.....!!“ (”تیرے بچہ میں“) وہ سب کو ہاند آئی ہے۔ اس میں کو ایکٹر لیس رمشاں شاہ نے غضب کی اداکاری جو کی ہے۔“ زین نے ماہ نور کو دیکھا۔

”زین.....! وہ تو ایویں سی لی کلاس اداکارہ ہے۔ سب لوگ تمہاری وجہ سے وہ ٹیلی فلم دیکھ رہے ہیں۔“ ماہ نور نے دل سے کہا۔

”ہاں.....! بس تم یہ بات کرنا چاہ رہی تھی۔“

”ہاں.....! میں یہ بھی کرنا چاہ رہی تھی۔ مگر ایک بات اور بھی ہے۔“ ماہ نور نے اپنی دوڑوں آنکھیں اچھی لگائی بڑی کر دیں۔

”کیا بات ہے؟“ زین نے کہا۔

”زین.....! تم اتنے رونے دھونے والے کیل کیسے کر لیتے ہو۔ ایسے لگتا ہے جیسے ہر بار تمہاری۔“

”یہ باتیں چھوڑ دو۔ تم وہ بات کر دو مجھ سے کرنے کی۔“ زین نے اس کی بات سنا کر پوچھا۔

”زین.....! میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں۔“ ماہ نور نے زین کی طرف دیکھا۔

”اور میں کسی اور سے؟ اس لیے تمہارے لیے ناواب کافی ہے۔“ زین نے اس کو اپنے کمرے میں لٹا دیا۔ اور دروازہ کھول کر نکل گیا۔ اس کو ماہ نور جین نے اپنا پسند نہیں۔

دل پر ہاتھ رکھ کر کہتی ہوں۔ آئی لو یو۔ اس نے زین کا ہاتھ تھام لیا۔ جسے فوراً جھٹکے سے زین نے چھڑا لیا۔

”میں کیا کہہ سکتا ہوں، مگر تم میری لائف پانزر نہیں بن سکتی۔ تم وہ نہیں ہو۔ اور جو تم محبت کی بات کر رہی ہو۔ یہ محبت نہیں تمہاری پسندیدگی ہے۔ تم آئندہ میرے پاس اس لفظ محبت کے لیے نہ آنا۔ اور آئی لو یو کوئی سوال نہیں ہے۔ جس کا جواب مانگا جائے۔“ زین نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ جیسے اس وقت دھواں دھواں ہو رہا تھا۔

”میں لیٹ ہو رہا ہوں، مجھے اسٹوڈیو جانا ہے، آج میری ریہرسلز ہے۔“ زین اپنی کار میں بیٹھا۔ اور اسے وہیں چھوڑ کر چلا گیا۔ وہ روتی ہوئی وہاں سے اپنی کار میں بیٹھ کر گھر جانے لگی۔

”زین.....!! جس طرح تم نے میرا دل توڑا ہے، اللہ کرے کوئی ہو، جو بالکل اسی طرح تمہارا دل توڑ دے۔“ وہ دل ہی دل میں اسے بدعوا دینے لگی۔ اس بات سے بے خبر کہ آل ریڈی زین کا دل ٹوٹ چکا ہے۔ اور وہ اپنے ٹوٹنے والی خاطر ہی تو سب کچھ کر رہا ہے۔ اپنے ٹوٹنے والی کے ٹکڑے تو جوڑ رہا ہے۔ اس لیے تو وہ ہر لڑکی سے دور ہو گیا ہے۔

☆ ☆ ☆

زین نے ہاف بازوؤں والی فی شرٹ پہن رکھی تھی، جس پر مشہور ریسلر جان سینا کی بڑی سی تصویر تھی۔ اس وقت وہ اپنے ہیوی بانیک پر بلسٹ پہن کر میوزیکل ٹائٹ سے واپس آ رہا تھا۔ اس میوزیکل شو میں اس نے میزبانی کے فرائض نبھائے تھے۔ اس سے پہلے زین اور غینا خان نے ڈرامہ (میرے دل کی آواز) میں کام کیا تھا۔ اور دونوں کی جوڑی اتنی ہٹ ہو گئی تھی کہ لوگ ان دونوں کو رینل لائف پارٹنر سمجھنے لگے تھے۔ مگر زین نے ہر اس خبر کی تردید کر دی تھی۔

اس کی کوشاں غنی خان بھی اس کے ساتھ تھی۔ وہ اس کی فیملی کو بوٹ تھی۔ غنی خان بھی اس سے شدید محبت کرتی تھی۔ اس نے ہمیشہ غنی خان کو نظر انداز کر دیا۔

رات کے بارہ سے اوپر کا وقت تھا۔ زمین ہلانی  
وے پر باینگ سے گزر رہا تھا۔ اب وہ من فلاتی ۱۱۱  
سے مین جی ٹی روڈ کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے ر  
بلٹ پہن رکھا تھا۔ جمنز کے ساتھ پاؤں میں جوگز  
شوز پہن رکھے تھے۔ مین روڈ کے قریب شہری ۱۱  
سے زرا دو ایک قبرستان واقع تھا۔

رات کے اس پہر قبرستان میں جانا تو دور کی بات۔  
لوگ قبرستان کا نام سننا گوارا نہیں کرتے تھے۔ زین۔  
بانیک کی رفتار دھیمی کی، اس نے ایک نظر قبرستان کی طرف  
ڈالی۔ اس کو قبرستان کا زنگ آلود گیت نظر آیا۔ قبرستان کا  
زنگ آلود سال خوردہ گیت بہت بھیا کنظر آ رہا تھا۔

زین نے قبرستان کو نظر انداز کر دیا، اور آگے بڑھ گیا۔ آگے شہری حدود شروع ہونے والے تھے۔ ابتدا ویران کھنڈرات سے ہوئی، آگے بڑے دیوبیل درختوں کی تاختم ہونے والی قطار تھیں۔ جو کافی دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ سڑک پر آکاڑے گاڑیوں کے سوا کوئی خاص گاڑیاں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ زین آگے بڑھ رہا تھا۔ اس نے ایک گاڑی سڑک کنارے کھڑی دیکھی، اس کے پیچھے لائسنس تھا۔ اس نے انسانی مدد کے خیال سے اپنی اسپرڈ بائیک سڑک کنارے روک دی۔ اور بانگ سے اس گاڑی کی طرف چلا گیا۔ مگر اس گاڑی میں کوئی بھی نہ تھا۔ اس نے اچھی طرح سے گاڑی کا جائزہ لیا۔

”کونئی ہے؟“ اس نے اونچی آواز میں پوچھا۔ اس ویرانے میں اسے اپنی بازگشت کے سارے تجبہ سنا ہی نہیں دیا۔

”گلتا ہے، لنٹ لیکر اس گاڑی کا مالک پتا“

نگاہیں پودے پر مرکوز کر دیں۔

وہ پودا صرف آگ کے لپیٹ میں تھا۔ مگر وہ جل نہیں رہا تھا۔ وہ آگ اس پودے کو جلا نہیں رہی تھی۔ وہ پھول صحیح سلامت تھے۔ اور اس میں سے جلنے کی بوئیں اُٹھ رہی تھی۔ اب زین جلتے گلاب کے پودے کے بالکل رو برو کھڑا تھا۔ اور اس کی حیرت کنی چند ہو گئی تھی۔ اس نے گلاب کے پھول میں دیکھا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ شعلوں میں گھرے گلاب کے اندر کسی لڑکی کا عکس نظر آ رہا تھا۔ اس عکس کو دیکھ کر زین چونک گیا۔ کیونکہ یہ کسی اور کا نہیں بلکہ سوہا کا عکس تھا۔

”سوہا“.....!! وہ زیر لب سوہا کا نام لیا۔

”سوہا“.....!! تم یہ ہو۔ مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ تم مجھے اس گلاب میں دکھائی دو گی۔“ وہ ایک تک سوہا کے عکس دیکھتے ہوئے خمار آلود انداز میں بولنے لگا۔

”سوہا.....!! جواب دو، تم کہاں ہو۔ اور مجھے

اس جلتے ہوئے گلاب کے پودے کے پھولوں میں کیوں نظر آ رہی ہو۔“ اس نے دھیرے سے پوچھا۔ مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ ڈھڑ ڈھڑ گلاب کا پودا جل رہا تھا۔ اس سے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ مگر وہ گلاب آگ سے بے اثر تھا۔ وہ بالکل تروتازہ تھا۔ اور اس کے تینوں گلاب زرد رنگ میں نظر آ رہے تھے۔

”میں یہ منظر اکثر اپنے خوابوں میں بھی دیکھ چکا ہوں۔ یہ بالکل وہی منظر ہے۔ میرے خواب بچے تھے۔ مگر ادھر سے تھے۔ سوہا تم کہاں ہو؟ کیا کسی مشکل میں ہو۔“ زین نے پوچھا۔ مگر اس کے جواب میں گہری خاموشی تھی۔

زین نے پودے سے نظریں ہٹائیں، اور دوبارہ اپنی نظر پودے پر مرکوز کر دیں۔ اس کو کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ یہ کوئی خیال نہیں تھا۔ حقیقت تھی، جو اس کے بالکل سامنے تھی۔ اس گلاب کے پودے کے اندر سوہا کا عکس دکھائی دے رہا تھا۔ جو تکلیف میں لگ رہا تھا۔

زین نے گلاب کا پھول توڑنے کے لیے آگے

ہے۔“ زین نے بانیگ اشارت کر دی اور آگے روانہ ہو گیا۔ آگے بہت بڑا میدان تھا۔ جس میں خود رو گھاس اور کانٹے دار جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ کچھ بڑے قدیم درخت بھی اسی میدان کا حصہ تھے۔ جو جنگلی تھے وہ اس وقت بہت بھیاں لگ رہے تھے۔ کانٹے دار پودے اس میدان کا حصہ ہونے کی وجہ سے کم لوگ ہی اس میدان میں جاسکتے تھے۔ زین نے رات کے اندھیرے میں میدان پر ایک ناپائیدہ سی نظر ڈالی۔ اس کو حیرت نے کنی جھٹکے بیک وقت لگ گئے۔

میدان میں کوئی پودا ڈھڑ ڈھڑ جل رہا تھا۔ بے ساختہ اس نے بیک لگا یا۔ وہ اسی طرف خوف سے دیکھ رہا تھا۔ ایک لمبے عرصے تک وہ اپنے خواب میں جلتے گلاب کا پودا دیکھتا آیا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر اس کو وہ یاد آ گیا۔ وہ رک گیا۔ اب اس کی نگاہیں جلتے گلاب کے پودے پر پکی ہوئی تھیں۔

”جلتے گلاب“.....!! زین زیر لب بڑبڑایا۔

وہ بانیگ سے اتر آیا۔ اس نے میدان میں جانے کا فیصلہ کر لیا۔ واقعی کوئی پودا بری طرح جل رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے پودے کو آگ لگا دی ہو۔ مگر پورے میدان میں وہی ایک پودا تھا۔ جو جل رہا تھا۔ اس کو غور سے دیکھنے کے بعد زین کو حیرت ہوئی۔ وہ بالکل اس کے ذرا اب والا منظر تھا۔ وہ حیرت سے پودے کو دیکھنے لگا۔

زین کے قدم بے ساختہ جلتے گلاب کی طرف ہٹ گئے۔ وہ جیسے انجانی کشش کے زیر اثر تھا۔ وہ ہیراں تھا۔ کیونکہ اس میدان میں کوئی دوسرا پودا تو جل ہی نہیں رہا تھا۔ وہ اب پودے کے بہت قریب تھا۔ اس نے غور سے دیکھا۔ وہ گلاب کا پودا تھا۔ جو آگ کے شعلوں کی لپیٹ میں بری طرح سے لپٹا ہوا تھا۔ اس پودے میں تین گلاب کے پھول تھے۔ جو سرخ رنگ کے تھے، مگر آگ کے شعلوں میں گرے وہ زرد رنگ کے نظر آ رہے تھے۔ اس نے غور کیا۔ وہ پودا آگ کے شعلوں میں گرا ضرور تھا۔ مگر اس سے دھواں نکل نہیں رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اس نے اپنی

باتھ بڑھایا، مگر پودے کو ہاتھ لگتے ہی اس نے ہاتھ واپس کھینچ ڈالا۔ پودے میں بجلی کی طرح کرنٹ تھا۔ پودے میں برقی رو کا کرنٹ تھا۔ زین کا ہاتھ ابھی تک سنسنار رہا تھا۔ زین نے سوبائیل نکالا۔ اور اس سے پودے کی ویڈیو بنانے لگا۔ اس نے سوبائیل میں کئی منٹس کی ویڈیو بنائی۔ ویڈیو کلپ بنا کر اس نے سیو کر لیا۔ اب سوبائیل جیب میں ڈالا۔

”سوبا!...!! تم کہاں چلی گئی ہو؟ مجھے کیوں اکیلا چھوڑ دیا ہے؟ ایک بار واپس مل جاؤ۔ میں تمہیں کہیں بھی جانے نہیں دوں گا۔ سوبا!...!! تم سن رہی ہوتا۔“

”سنو!...!! میں آج بھی اتنے سارے لوگوں میں بالکل اکیلا ہوں۔“ زین نے بے چینی سے کہا۔

”دیکھو!...!! میں نے تمہیں کہاں کہاں تلاش نہیں کیا؟ ہر جگہ تمہیں تلاش کرتا رہا۔ مگر تم کہیں بھی نہ ملی۔ ہر اس جگہ بار بار گیا، جہاں تمہارے ایک فیصد بھی ملنے کی امید ہوتا اور آج جب تم مل گئی ہو۔ لیکن چلتے گلا

ب میں۔۔۔۔!! یہ کیا معنی ہے؟ جب سے تم میری زندگی سے مل گئی ہو۔ میری زندگی میں قحطی کے سوا کچھ بھی نہیں بچا ہے۔ میں تمہیں تلاش کروں گا یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔“ زین نے اپنا ہاتھ آگے کیا اور اس پر اپنا دوسرا ہاتھ رکھ کر خود سے وعدہ کر لیا۔

”سوبا!...!! میں نہیں جانتا کہ میرے خوابوں میں تم اس طرح کیوں نظر آتی رہی ہو میں یہ بھی نہیں جانتا کہ ان سب کے پیچھے اصل کہانی کیا ہے؟ مگر میں خاموش نہیں بیٹھوں گا۔ میں تم تک پہنچ جاؤں گا۔“ زین بے بسی سے سسکتے لگا۔ اسے یہ سب بہت مشکل لگ رہا تھا۔ مگر نامکن نہیں تھا۔

”سوبا!...!! میں تم سے آج بھی اتنی ہی محبت کرتا ہو جتنی پہلے دن کرتا تھا۔“ وہ بار بار سوبا کو مخاطب کر رہا تھا، جیسے وہ اس کی بات سن رہی ہو۔

سوبا!...!! کچھ تو بولو ناں!...!! میری یہ خوشی بھی عارضی ہے۔ تم تو مجھے ادھوری بھی نہیں مل سکی ہو۔ یہ جھٹک تو مجھے خوابوں میں بھی دکھائی دیتی تھی۔ یہ بالکل ایک سایے

کی طرح ہے اور سایہ تو کبھی بھی غائب ہو سکتا ہے۔ اس نے ایک قدم بڑھا کر دھیرے سے سرگوشی کی۔

”سوبا!...!! تم کچھ بولتی کیوں نہیں ہو؟ کیا تم اس چلتے گلاب میں قید ہو گئی ہو۔ سوبا جواب دو!...!! بس ایک بار اس سچائی سے پردہ ہٹا دوں۔ تم کوئی بات تو کرو۔“ اس کے آنسو بہنے لگے۔ اس نے اپنے آنسو آستین سے صاف کر دیے۔

”سوبا!...!! تم کیوں ایسی خاموش ہو۔“ اس نے ہنسی کی۔

”سوبا!...!!“ زین پوری شدت سے چیخا۔ آخر اس نے اپنا ضبط کھوی دیا۔ وہ کب تک ایک عکس سے مخاطب ہو سکتا تھا۔ اس دیرانے میں اس کی اپنی چیخ کی بازگشت سنائی دینے لگی۔ جب ضبط کی حد ختم ہو جائے تو انسان بے بسی کی انتہاء پر کھڑا ہوتا ہے۔ اور

زین اس وقت بالکل بے بس تھا۔ وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ سوبا کو دیکھ تو سکتا تھا۔ مگر کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ یہ عکس کسی گمشدہ سایے کے مانند تھا۔ اس کا کچھ وجود نہیں تھا۔ یہی تو وہ شدت غم سے چیخ رہا تھا۔ اس دیرانے میں وہ بالکل اکیلا تھا، اس کا سایہ بھی اس سب میں اس کے ساتھ نہیں تھا۔ اسے چپ کروانے والا نہ دینے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ کوئی اس کا سہمچھ نہ تھا۔ اس کا دل ہی نہیں

کر رہا تھا کہ وہ اس دیرانے سے جائے۔ وہ سسک رہا تھا اور پودے کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے متواتر آنسوں بہہ رہے تھے۔ اس کا دل کسی بھی چیز میں نہیں لگ رہا تھا۔ وہ بس خاموشی سے سسک رہا تھا۔ وہ کتنی دی ریر تک اس چلتے گلاب کو دیکھتا رہا۔ کتنی دیر گزر گئی اسے کچھ احساس نہ ہوا۔ وہ یہاں اسی پودے کے پاس

رات گزارنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ اس کی کمر میں کانٹے دار جھاڑیاں گھس رہی تھیں، مگر اسے مطلق پرواہ نہیں تھی۔ وہ کچھ دیر بند آنکھیں کر کے سوچتا رہا۔ وہ ہوش و خرد سے بیگانہ ہونا چاہتا تھا۔

☆☆☆☆☆☆

ہوش تو اسے تب آیا جب اس کی سوبائیل کی ٹھنسی



سے زیادہ پوٹیشنل اور توانائی آپ کے اندر ہے، میں اپنے سارے شوق پورے کر لوں۔ پھر چھوڑ دوں گا۔ یہ شوہر کا سلسلہ بھی!!!!!! پھر آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔“

”زین.....!! یار مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے، یہ جتنا بھی سب کچھ ہے تمہارا ہی تو ہے۔“ ڈیڈ اس بار نرم لہجے میں بولے۔

”ڈیڈ.....!! آپ میرے ہیں اور سب کچھ آپ کا ہے۔ بس جب آپ میرے نہیں، تو سب کچھ میرا ہی ہے۔“ زین کی بات پر ڈیڈ ہنس پڑے۔ زین کا دل بھی باپ کی باتوں سے کچھ دیر کے لیے بہل گیا۔

”ٹھیک ہے زین.....!! شاباش جلدی سے گھر پہنچو۔ میں اب اور انتظار نہیں کر سکتا۔“

”بس آ رہا ہوں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔“ زین نے رابطہ منقطع کر دیا۔ اور اپنی جگہ اٹھ کھڑا ہوا اس نے جلتے گلاب کو دیکھا۔ وہ ابھی اسی طرح آگ کے شعلوں میں لپٹا ہوا تھا۔ اور پھولوں کے اندر سوہا کا کلس دکھائی دے رہا تھا۔

”سوہا.....!! میں اس سے مجھے کو ضرور مل کر دوں گا۔ میں یوں تمہیں جلتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔ میں تمہیں ڈھونڈ کر یہ اذیت ختم کر دوں گا، جو اس وقت تمہارے چہرے پر رقم ہے۔“ وہ اٹھا اور ایک بار پھر جلتے گلاب کو بنور دیکھا۔ اس نے گلاب کے پودے کی طرف ہاتھ بڑھایا اور جیسے ہی اس کا ہاتھ اس سے چھو گیا اس کو جھٹکا لگا تو وہ کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اسے جیسے کزنٹ لگا تھا۔

”کاش.....!! میں یہ پودا اپنے ساتھ لے جا سکتا۔ یا اس میں سے کوئی ایک پھول تو ذکر اپنے ساتھ لے جاتا۔“ اس نے بے بسی سے گلاب کی طرف دیکھا۔ پھر اس نے سوہا کے کلس کے ساتھ عہد و پیمان کے لاور وہاں سے جانے لگا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس کے قدم آگے کو بڑھے۔ مگر اس کا دل بالکل بھی یہاں سے جانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن اس کے ڈیڈ اور مام پریشان ہو گئے تھے۔ وہ ان کا دل بھی مزید نہیں دکھاتا

ناگہمی۔ اس نے ناچاچے ہوئے بھی جیب سے سل والا۔ اسکرین پر ڈیڈ کا نمبر آ رہا تھا۔ اسے یہ سوا بیکل اس وقت دنیا کی نحوس ترین شے لگا۔ کیونکہ اس نے اس کی دج میں خلل ڈالا تھا۔

”ہیلو.....!! ڈیڈ.....!! اس نے مہمبیر لہجے میں کہا۔

”زین.....!! کہاں رہ گئے ہو یار؟“ ڈیڈ کی فکر میں ڈوبی آواز زین کے کانوں میں آئی۔

”ڈیڈ.....!! میں ٹھیک ہوں، راتے میں ہوں۔ کمر آ رہا ہوں۔“ اس نے باپ کو تسلی دی۔ رات بھی دانی ہو گئی تھی۔

”گنڈ.....!! جلدی آ جاؤ.....!! تمہاری مام بہت پریشان ہو رہی ہیں۔“ ڈیڈ کی فکر میں ڈوبی آواز بالکل سے ابھری۔

”میں آ رہا ہوں۔ مام سے کہیے گا کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ زین نے کہا۔

”ہاں.....!! میں کہہ دوں گا۔ اس وقت شہر کے حالات کا کچھ بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ تم جلدی سے گھر آ جاؤ۔“ ڈیڈ نے اسے حکم دے لہجے میں کہا۔

”جی بالکل.....!! بس آدھے گھنٹے تک آ رہا ہوں۔“ زین نے اپنی طرف سے ڈیڈ کو تسلی دی۔

”گنڈ.....!! آج کل کچھ پتہ ہی نہیں چلتا کب کیا جائے؟“ ڈیڈ نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔

”ڈیڈ.....!! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ واقعی آج کل حالات بے حد خراب ہیں کہ کب کیا جائے؟ کچھ پتہ ہی نہیں چلتا۔“ اس نے باپ کی بات اپنے معنوں میں دہرائی۔

”اسی لیے تو یار.....!! میں کب سے کہہ رہا ہوں کہ تم یہ شوہر کا چکر چھوڑ دو۔ بس اب میں مزید یہ رات والے پروگرامز بالکل بھی برداشت نہیں کر دوں گا۔ تم اپنا ٹیلی بزنس جوائن کر لو۔“ ڈیڈ اس کے شوہر کے چکر سے فنت ڈالتے تھے۔

”ڈیڈ.....!! ابھی تو آپ بالکل یک ہیں، مجھ

اپنی باقی سفر منزل تک اختتام پذیر کر دو۔“ اس نے مام ڈیڈ کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر حیرت تھی۔  
 ”بیٹا تمہاری شادی کی خواہش میرے دل میں  
 تب سے ہے۔ جب تم پیدا ہوئے تھے۔ اور اب تم  
 انکار بالکل بھی نہیں کرو گے۔“ ماں کا چہرہ جیسے کوشی سے  
 چمک رہا تھا۔

”مام.....!! ڈیڈ.....!! میں فی الحال بیٹا شادی  
 کے بہت خوش ہوں۔ میں ابھی شادی کر کے اپنا کریئر  
 ڈسٹ ٹرائے نہیں کرنا چاہتا۔ میں جب بھی شادی کرنا  
 چاہوں گا۔ سب سے پہلے آپ کو بتاؤں گا۔ ابھی مجھے  
 اپنی آزادی بے حد عزیز ہے۔“ اس نے ماں باپ کی  
 طرف دیکھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا تھا کہ وہ  
 کیا کہے۔

”زین.....!! اب یہ بہانہ نہیں چلے گا۔ میں  
 سیریس ہوں۔“ مام نے پیار سے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔  
 ”مام.....!! یہ کوئی بہانہ نہیں ہے، میں بھی بالکل  
 سنجیدہ ہوں۔ مجھے ابھی وہ لڑکی ملی تھی نہیں ہے، جو اس  
 گھر کی بہو بن سکے۔ میں ابھی تک خود کسی کی تلاش میں  
 ہوں اور میری تلاش ابھی نامکمل ہے۔“ اس نے اپنا  
 چہرے کو سنجیدہ سا بنا کر ماں کی طرف دیکھا۔ اس بار اچھے  
 اور مام حیرانی سے اسے دیکھنے لگے۔

”مام.....!! ابھی میں کسی سے بھی شادی نہیں  
 کرنا چاہتا۔ میری زندگی میں ابھی بہت کچھ ہے!  
 ہے۔ ابھی تو میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔“

”بیٹا.....!! ماہ نور جنین.....!! کیسی لڑکی ہے وہ  
 ہم تمہارے لیے کوئی غلط فیصلہ نہیں کریں گے۔ تم اس  
 کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ وہ خاندانی لڑکی ہے۔ اور  
 تمہارے ڈیڈ کے دوست ندیم اعوان کی بیٹی ہے۔ وہ  
 دونوں ابھی ان کے بارے میں ہی بات کر رہے تھے۔“  
 ”ہاں.....!! بیٹا.....!! بالکل ماہ نور جنین ہے۔  
 خوبصورت لڑکی ہے۔ اگر تمہیں وہ پسند ہو۔ تو ہم، والد  
 تمہاری بات چلاتے ہیں۔“ ڈیڈ نے زین کی طرف  
 دیکھا۔ زین کے چہرے پر حیرت کے آثار تھے۔

چاہتا تھا۔ اب وہ اس میدان سے نکل کر سڑک پر آ گیا  
 تھا۔ اس نے اپنی بائیک اشارت کی۔ اور گھر کی طرف  
 روانہ ہو گیا۔ وہ بے حد پریشان تھا۔ اس کا پاور، پیسہ، فیم،  
 کوئی بھی چیز اب مددگار نہیں رہا تھا۔ وہ لوگوں کے لیے  
 ایک ہیرو تھا، مگر وہ خود کو اس وقت بالکل زیر و برگ رہا  
 تھا۔ اور وہ سوچ رہا تھا کہ اس معاملے کا سرا کہاں سے  
 نکالے۔ کیونکہ یہ سب اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

انہی سوچوں میں غلطاں اب وہ گھر کے بالکل  
 سامنے تھا۔ وچ مین نے مین گیٹ کھول دیا۔ اس نے  
 بائیک اندر کی۔ اور گیراج میں کھڑی کر دی۔ وہ اب گھر  
 کے اندرونی طرف جا رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

گیراج میں بائیک کھڑی کر کے وہ وسیع و  
 عریض لان سے گزر رہا تھا، کہ اسے لان میں ڈیڈ اور مام  
 دکھائی دیے، وہ حیرت سے ان دونوں کو دیکھنے  
 لگا۔ رات بہت ہو گئی تھی۔ اور یہ دونوں کرسیوں پر بیٹھے  
 اتنی رات کو کیا کر رہے تھے۔ بے ساختہ اس کے قدم اسی  
 سمت بڑھ گئے۔

”السلام علیکم“.....!! اس نے اونچی آواز میں  
 بیک وقت دونوں کو سلام کیا۔

”علیکم السلام“.....!! بیک وقت دونوں نے کہا۔

”زین بیٹا.....!! اچھا ہوا کہ تم وقت پر آ گئے۔

تمہارا ہی انتظار ہو رہا تھا۔“ ڈیڈ نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

”اچھا.....!! کوئی خاص بات کرنی تھی کیا؟“

زین ان کے پاس خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔

”ہاں.....!! بہت خاص بات ہے، بیٹا اب تم

بڑے ہو گئے ہو، اللہ کا دیا سب کچھ ہمارے پاس موجود

ہے۔ اور اوپر سے تم اتنی خاصے کمانے لگ گئے ہو۔

تمہارا مام چاہ رہی ہیں کہ اب تمہارے ہاتھ میں کسی کا

ہاتھ تھما دیا جائے۔“ ڈیڈ نے بات آگے بڑھا دی۔

”بالکل زین.....!! تمہارے پاپا اور میری دل

سے خواہش ہے، کہ تم اب کسی کے ساتھ قدم سے قدم ملا

کر چلنا شروع کر دو اور زندگی بھر اس ہم سفر کے ساتھ

بہت امیر و کبیر ہم بلہ خاندان میں کرنے کے خواہش مند تھے۔ وہ اپنے جیسے اسٹیلش فیملی میں اس کی شادی کے خواہش مند تھے۔ ندیم اعوان کی فیملی ان میں سے ایک تھی۔ وہ سیاست میں بھی بہت آگے تھی۔ ڈیڈ بار بارنی میں سر ہار ہے تھے۔

”ابرار.....!! کیا کہتے ہو؟ زین کی پسند کو کبھی دیکھا ہے؟ یہ کسی کی بیٹی ہو سکتی ہے؟“ زرتاشہ نے معنی خیزی سے پوچھا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ نہیں!! جیتنے لوگوں سے میرے تعلقات ہیں۔ ان میں سے کسی کی بیٹی کا نام سواہ نہیں ہے۔“ ابرار نے کہا۔

”ابرار.....!! مجھے اب ڈر لگنے لگا ہے۔ کہیں زین.....!! کسی کو اشارہ پر تو نہیں مرنے لگا ہے۔ یہ اداکار کی بہت بڑی جادوگریاں ہوتی ہیں۔ کسی کو بھی پاگل کر سکتی ہیں۔ آئے روز زین کا کسی نہ کسی اداکارہ کے ساتھ ایئر کی خبریں آتی رہتی ہیں۔“

”میرے خیال میں زین اتنا بھی بیوقوف نہیں ہے کہ کسی کو اشارہ پر فدا ہو جائے۔“ ابرار نے معنی خیزی سے کہا۔

”تو پھر.....!! وہ کون ہو سکتی ہے؟“ زرتاشہ نے ٹھوڑی تلے ہاتھ رکھا۔

”تم زیادہ فکر مند نہ ہو.....!! وقت آنے پر سب پتہ چل جائے گا۔ ابھی بہت دیر ہو گئی ہے۔ آؤ اندر چلیں۔“ ابرار اٹھے تو زرتاشہ بھی اٹھ گئی۔ وہ دونوں اپنے کمرے کی طرف جا رہے تھے۔ لان بالکل سنسان رہ گیا۔ اب وہاں کوئی نہ تھا۔

☆.....☆.....☆

زین کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ بار بار اس کی نگاہوں میں جلتے گلاب مگوم پھر رہے تھے۔ وہ جب بھی آنکھیں بند کرتا۔ اس کی نیند میں ڈوبی آنکھیں وہی منظر کھینچ کر اس کے ذہن میں گھما دیتیں۔ وہ سوچ بھی وہی رہا تھا۔ وہ تب سے آنکھیں کھول دیتا۔ اور جلتے گلاب میں اسے سواہ کا عکس پریشان کرتا رہتا تھا۔ اسے اس وجہ سے

نو.....!! مام ڈیڈ.....!! وہ لڑکی خوبصورت اور خاندانی ضرور ہے۔ مگر خوب سیرت نہیں ہے۔ وہ کوئی افریقین آسٹم کرل کے سوا کچھ نہیں ہے۔ مجھے ایسی بد تمیز لڑکیاں بالکل بھی پسند نہیں ہیں۔ وہ تو افریقین فلز کے ایکٹر۔ سر سے زیادہ بولڈ ہے۔“ زین کی بات پر مام ڈیڈ نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اور زین نے ان کو کھلے لفظوں میں سمجھا بھی دیا۔ آئندہ کے لیے اس کا نام ماہ نور جین سے قطعاً منسوب نہ کیا جائے۔

”زین.....!! اگر تمہاری نظر میں کوئی اور لڑکی ہو، تو ہاں۔ ہم وہاں جا کر تمہاری بات چلا سکتے ہیں۔“ ماں سمجھ رہی تھی۔ فوراً بیٹے کی دل کی بات سمجھ گئی، انہوں نے سوچا کہ بیٹے کے دل میں کوئی آپس میں گھٹی ہے۔ اب اس کا نام تو لم از کم وہ جان لے۔ سچی اس کی دل کی بات کی۔

”ہاں.....!! مام.....!! اس نے دھیرے سے اعلان کیا۔

”کون ہے؟ کہاں رہتی ہے؟ کیا کرتی ہے؟“ اس کی بیٹی ہے؟ کیا ہم اسے جانتے ہیں؟“ مام جوش پوچھنے لگیں۔

”مام.....!! اس کا نام سواہ ہے۔ وقت آنے پر میں اسے آپ سے ضرور ملواؤں گا۔“ اس نے مام کی بات دیکھا۔ زین کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا۔ اور دوسرا چارہ تھا۔ سواہ کے ذکر پر اس کا اندر باہر ہون سے بھر گیا تھا۔

”اجنبی ٹھیک ہے۔ جیسی تمہاری مرضی“.....!!

ان نے اس کی آنکھوں میں روشنی سی دیکھی۔

مام، ڈیڈ.....!! میں بہت زیادہ تھکاؤٹ محسوس کرتا ہوں۔ اب میں آرام کرنے جا رہا ہوں۔“

”بالکل.....!! تم جاؤ.....!!“ ڈیڈ نے پیار سے کہا تو زین وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ مام ڈیڈ ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگے۔ ڈیڈ بہت پریشان ہو گئے تھے۔ ان کے چہرے پر اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔ وہ کبھی بھی نہیں چاہتے تھے کہ زین کسی اور کو پسند کرے۔ وہ زین کی شادی

بالکل بھی نیند نہیں آ رہی تھی۔ اس نے اپنا موبائل جیب سے نکالا۔ اور وہی ویڈیو کلپ پلے کر دیا۔

ویڈیو میں وہی منظر تھا۔ جو ابھی وہ بند آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ یہ اس چٹائی کا سب سے بڑا اثبوت تھا۔ جو اس کے پاس محفوظ تھا۔

”اگر میں کسی کو یہ ساری بات بتاؤں، تو لوگ مجھے پاگل سمجھیں گے۔ کوئی میرا یقین ہی نہیں کرے گا۔ سب میرا مذاق اڑائیں گے۔ اور اس معاملے میں صرف ایک پرہیز ورہ کر سکتا ہوں۔ وہی میری مدد کر سکتا ہے۔ وہ ذات صرف اللہ کی ہے۔“

اب وہ واش روم میں تھا۔ کچھ دیر کے بعد وہ بالکل ترد تازہ تھا۔ اب وہ کمرے میں نماز پڑھ رہا تھا۔ اور اب وہ اللہ سے مدد مانگ رہا تھا۔ دعا کر رہا تھا۔ پہلی بار کسی لمحے میں اسے سکون کی سانسیں نصیب ہوئی تھیں۔ کچھ دیر پہلے زین سخت پریشان تھا۔ اور وہ جیسے ضبط کے کھڑے مراحل سے گزر رہا تھا۔ اب وہ جائے نماز پر اللہ کے حضور سجدہ ریز تھا۔ نماز پڑھ چکا تھا۔ یہ سجدہ اللہ سے مدد مانگنے کے لیے کیا تھا۔ وہ کئی دیر سجدہ ریز رہا۔ اس کا لب سجدہ اس کی سکون کا باعث بنا۔ اس نے جائے نماز فولد کی۔ اور پٹنگ پر لیٹ گیا۔ ساری رات وہ جاگتا رہا۔ وہ جب بھی آنکھیں بند کر دیتا۔ کت سے وہی جلتے گلاب کا منظر اس کے سامنے نمودار ہو جاتا۔ وہ فوراً آنکھیں کھول دیتا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ آگے ایسا کیا کرے کہ سوہا اس کو مل جائے۔ مگر یہ سب بہت مشکل تھا۔ مگر ناممکن نہیں تھا۔ اگر سوہا کسی جلتے گلاب میں مقید ہو سکتی تھی تو اس سے نکل بھی سکتی تھی۔

ہر چیز شروع میں بے حد مشکل لگتی ہے۔ مگر پہلے قدم کے بعد وہ مشکلات کہیں گم ہو جاتی ہیں۔ اور ایک راستہ بن جاتا ہے۔ وہ راستہ پھر آسمان ہو جاتا ہے۔ کوئی آپ کو آگے بڑھنے سے نہیں روک سکتا۔

زین ساری رات سو نہ پایا۔ دور قریب سے صبح کی اذانیں بلند ہونے لگیں۔ تب وہ اذانوں کو بغور سننے لگا۔ اسے اس میں سکون ملنے لگا۔ وہ اٹھا اس نے

وضو دوبارہ تازہ کیا۔ اور نماز پڑھنے چلا گیا۔ وہ جب واپس آیا۔ تو صبح کی پھو پھٹ چلی تھی۔ آسمان پر ایک ستارہ روشن تھا، وہ صبح کا ستارہ تھا۔ سارے راستے وہ اسی امید کے ستارے کی طرف دیکھتا آیا تھا۔ جو آسمان میں صبح کی روشنی کے باوجود روشن تھا۔ اور سارے جہاں کو دور سے بھی نظر آ رہا تھا۔ وہ اب اپنے کمرے میں تھا۔ اس نے دونوں آنکھیں بند کر کے گہری سانسیں لیں۔ اور بیئر پر لیٹ گیا۔ نیند کی دیوی اس پر دیر سے مہربان ہوئی، تو وہ اپنے آپ سے بے خبر ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

اور جب اس کی آنکھ کھلی، تو اچھی خاصی دو پہر ہو گئی تھی۔ اس نے بے ساختہ گھڑی کی طرف دیکھا۔ وہ بجنے والے تھے۔ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اور جلدی سے واش روم میں گھس گیا۔ وہ بالکل فریش تھا۔ وہ جلدی سے کیراج کی طرف بڑھا۔ کیراج میں مام، ڈیڑھ کی گاڑیاں نہیں تھیں، وہ دونوں اپنے کاموں پر چلے گئے تھے۔ اب وہ گاڑی میں رات والے میدان کی طرف جا رہا تھا۔ شہر میں خوب ٹریفک تھا۔ اسکول کی چنٹی ہو گئی تھی۔ جگہ جگہ سے ہارن کے آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ بڑی مشکلوں سے ٹریفک کے اوڈھام سے نکل گیا۔ اب اس کا رخ میدان کی طرف تھا۔ یہ بہت بڑا میدان تھا۔ شہر کی مضافات سے اچھا خاصہ دوری پر واقع تھا۔ وہ مظلوم جگہ پر پہنچ گیا اس نے سڑک کنارے گاڑی روک دی، اور میدان کی طرف قدم بڑھانے شروع کر دیے۔ اس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو رہی تھیں۔

”کہیں وہ گلاب جل کر کوئلہ نہ ہو گیا ہو۔ یا پھر اب کہیں غائب نہ ہو گیا ہو“ اس نے تیز قدم آگے بڑھانے شروع کر دیے۔

”نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔!! ایسا نہیں ہو سکتا۔“  
”میں میری سوہا مقید ہے۔ وہ گلاب گم نہیں ہو سکتا۔“  
”خود کو دلا سہ دیا۔ اور میدان میں آگے بڑھتا چلا گیا۔“  
”سوہا۔۔۔!!“  
چلیز ایک بار دوبارہ آ جاؤں ناں۔ میں اس بار تمہیں کھونے کا حوصلہ نہیں ر



تھا۔ اس گڑھے کے اوپر خود رو جھاڑیاں ڈال دی تھیں۔ زین نے پودوں کی طرف غور سے دیکھا۔ وہاں ان پتوں پر انسانی خون کے قطرے بھی گرے ہوئے تھے۔ مگر یہ قطرے بہت کم تھے، پودا نکالنے کی کوشش میں کسی کا ہاتھ زخمی ہو گیا تھا۔ اور اس سے کچھ خون یہاں وہاں پتوں پر گر گیا تھا۔ پودا نکالنے والا ضرور زخمی ہو گا۔ اور وہاں سے چلا گیا ہو گا۔ وہ خون خشک ہوا تھا۔

”اوشت.....!! میرے جانے کے بعد کون یہاں آیا تھا۔ اور پودا جڑ سمیت نکال کر لے گیا۔“ زین نے غصے سے مکا ہوا میں لہرایا۔ وہ صدے سے اپنی ہڈ پر بیٹھتا چلا گیا۔

”نہیں.....!! ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ تو کرٹ دے رہا تھا۔ ایسا کوئی کیوں کرے گا۔ جو کس نے نہ کر سکا۔ وہ کسی اور نے کر دیا۔ مگر کیسے.....!! کس نے؟ مگر کسی نہ کسی نے تو یہ کام ضرور کیا ہے۔ مگر کیسے؟ کوئی تو میرے جانے کے بعد یہاں پر آیا تھا۔“

نکدہ کسی کو تو پتہ چلا ہو گا۔ جیسے مجھے پتہ چلا تھا۔“ وہ وقت شدید غصے میں لگ رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو کڑیاں مار رہا تھا۔ مگر ٹھیک طریقے سے کوئی ایک آواز کڑی ہی ملا پاتا۔ اور غصے سے اس کا دماغ کام آ جھوڑ دیتا۔ وہ چھپتا بھی رہا تھا کہ وہ کیوں رات کو جگہ سے چلا گیا۔ اور کسی دوسرے کو موقع مل گیا۔ اسے اپنے آپ پر آ رہا تھا، کہ وہ کیوں اس پودے حفاظت نہیں کر سکا۔

”کوئی تو ہے.....!! جو میرے اور سوا ہ کے میں ہے۔ وہ کون ہے مجھے اس کا پتہ لگانا ہے۔ کل! نے اس جلتے گلاب میں سوا ہا.....!! صرف سوا ہا کا دیکھا تھا، اور میں کتنا مطمئن ہو گیا تھا۔ میں نے تھا۔ تم دوبارہ میری زندگی میں آ جاؤ گی۔ میں نے رات مام کے سامنے تنہا رات نام بھی لے لیا تھا۔ اور ڈیڈ کو میری پسند پر کوئی اعتراض بھی نہیں تھا۔ دونوں زنی کا تاثر دیا تھا۔“

وہ صدے سے بے حال ہو کر سسکتا چلا

سکتا۔ جس طرح وہ گلاب جل رہا تھا۔ اسی طرح میں بھی جل رہا ہو۔ مگر کسی کو نظر نہیں آ رہا۔ تنہا رہی جدائی نے میری روح کو بہت ترپایا ہے۔ سوا ہا.....!! اس بار مجھ سے جدا مت ہونا۔ میں مر جاؤں گا۔“ وہ خود سے بولتا ہوا میدان میں کافی دور تک آ گیا تھا۔ وہ اپنے دل کو ڈھارس بھی دے رہا تھا۔ میدان جھاڑیوں سے بھرا تھا۔ اسے بہت مشکل ہو رہی تھی۔ ہر جگہ دھول مٹی اور گرد و غبار تھا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی، کہ اس نے رات کو جلتے گلاب کا پودا کونسی جگہ دیکھا تھا۔ وہ میدان کے وسط میں پہنچ چکا تھا۔ میدانی گھاس جو کانٹوں کی طرح نو کیلی تھی، حد نظر تک پھیلی ہوئی تھی۔ زین نے جلتے گلاب کا پودا بہت تلاش کیا۔ مگر اسے کہیں بھی نہ ملا۔ اس نے ذہن پر کافی زور ڈالا کہ کہیں وہ غلط جگہ تو نہیں آ گیا ہے۔ مگر نہیں وہ کل اسی میدان میں آیا تھا۔ اس نے ہر جگہ وہ پودا بالوں کی طرح ڈھونڈنا شروع کر دیا۔

”ان جنگلی پودوں کے بیج ہی وہ پودا تھا۔ مگر ابھی اس ویرانے میں وہ کہیں بھی نظر نہیں آ رہا ہے۔“ اس نے ذہن پر کافی زور ڈالا۔ مگر وہ غلط نہیں تھا۔

”ایسے کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ پودا کیسے کہیں گم ہو سکتا ہے؟“ اس نے کدہ ہاتھ پر مارا۔

”مجھے یہاں سے رات کو جانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ کیونکہ رات کو اسی جگہ وہ جلتے گلاب کا پودا تھا۔“ اس نے اپنے آپ کو دلاسا دیا۔ مگر وہ اب بھی وہاں بالکل بت کی طرح کھڑا تھا۔ اچانک اس کے ذہن میں کونداسا لپکا۔ اس نے زمین کا بچھا حصہ دیکھنا شروع کر دیا۔ کانٹوں میں زمین کو دیکھنا کافی مشکل کام تھا۔ مگر اسے یہ سب کرنا تھا۔ اس کوشش میں اس کے ہاتھوں پر کئی خراشیں بھی پڑ گئیں۔ مگر اس نے قطعاً پرواہ نہیں کی۔ کچھ دیر کی کوشش کے بعد اس نے وہ دیکھ لیا، جو کچھ وہ دیکھنا چاہتا تھا۔ کسی نے وہ جگہ کھودی تھی۔ اور وہاں سے وہ جلتے گلاب کا پودا نکال دیا تھا۔ وہاں سخت اور کھردری زمین سے وہ پودا کوئی لے گیا تھا۔ کیونکہ ایک جگہ چھوٹا سا گڑھا تھا۔ جو ٹھیک سے کسی نے بھرا بھی نہیں

اس کے گم نہیں ہوئی ہو، ہمارے درمیان کوئی تیسرا فرد ہے۔ جو نظر نہیں آ رہا ہے۔ مگر مجھے اسے ڈھونڈنا ہے۔ وہ جو کوئی بھی ہے، انہی نظروں سے اوجھل ہے۔ مجھے تمہارے ساتھ ساتھ اس تیسرے آدمی کو بھی ڈھونڈنا ہو گا۔ تب میرا سارا مسئلہ سلجھ جائے گا۔ سو ہا اس نے پہلے مجھ سے شہیں چھینا۔ اور بعد میں تمہارے عکس کو بھی چھین لیا۔ آج ایک بار پھر میں خالی ہاتھ ہوں۔“ وہ کئی لمحوں تک اسی جگہ بے آواز سستار ہا۔

☆.....☆.....☆

کچھ دیر بعد اس کی موبائل کی بل بج اٹھی۔ اس نے موبائل نکال کر آنکھوں کے سامنے کیا۔ تو اس کو حیرت ہوئی۔

”اوہ.....!! آج تو میں نے شوٹ کر جانا تھا۔ ڈائریکٹر اکرام اللہ کے ڈرامے کا آج کل ٹکس سین کرنے تھے۔“ اس نے ہاتھ ماتھے پر مارا۔ اور اٹھ بیٹھا۔ اس نے کال پک کی۔

”ہیلو.....!! سر السلام علیکم“..... اس نے اکرام اللہ سے کہا۔

”کہاں ہو یا.....!! سب تمہارے شوٹنگ اسپاٹ پر انتظار کر رہے ہیں۔ اور تم غائب ہو۔“

”سوری سر.....!! ایک ضروری مسئلے میں پھنس گیا تھا۔ بس آ رہا ہوں۔“ اس نے معذرت خواندہ انداز میں کہا۔

”جلدی پہنچ جاؤ۔ ہم ایک گھنٹے سے ویٹ کر رہے ہیں، ہیرن کو دوسرے ڈائریکٹر کے شوٹ پر بھی جانا ہے۔ پوری کاسٹ جمع ہے۔“ اکرام اللہ نے کہا۔ اور رابطہ منقطع کر دیا۔

”اوکے سر.....!! بس ابھی پہنچ رہا ہوں۔ آپ سب کو رپڈی کر دیں۔“

”سب میرا انتظار کر رہے ہیں، اور میں اس دیرانے میں ماتم کر رہا ہوں۔“ اسے اپنے آپ پر غصہ آیا۔ وہ اٹھا اس نے کپڑے جھانڈے۔ اور میدان سے نکل کر گاڑی کی طرف جانا شروع کر دیا۔ اب وہ گاڑی

اس کی بڑی بڑی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ اور وہ پانی انبار کی صورت اس کے رخسار پر بہتا چلا گیا۔ زمین کے اس سب کچھ تھا۔ دولت، شہرت، پیسہ، پیار کرنے والے ماں باپ، اگر کچھ نہیں تھا تو وہ اس کا سچا پیار نہیں تھا۔ کیا وہ پیار کے معاملے میں بد قسمت تھا، یا پھر وہ اتنا ابھی نہیں آیا تھا۔ ان دونوں کے بیچ کوئی تیسرا مائل تھا۔ زمین کے پاس سب کچھ بہترین تھا۔ مگر وہ کچھ نہیں تھا۔ جو وہ چاہتا تھا۔ وہ سو ہا کا ساتھ تھا۔ اور ابھی وہ اس کا تھا۔ پانے سے پہلے اقرار کرنے سے پہلے سو ہا اس کی زندگی سے نکل کر کہیں گم ہو گئی تھی۔

”سو ہا.....!! وہ وقت کب آئے گا۔ جب تم میری آواز ہوگی، اور میں تمہیں یہ قہری بیچک روڈز کہو گا۔“

”سو ہا.....!! آئی لو یہ.....!!“ وہ اس دیرانہ بدن میں چیخ رہا تھا۔ اب وہ خاموش تھا۔ اور اسی زمین پلینا، اس کے پیٹھ میں کتنے کانٹے چھب گئے تھے۔

”کیا میں خالی ہاتھ ہوں؟“ اس نے خود سے کہا۔ اور خاموش ہو گیا۔

”میرے لیے وہ جلتے گلاب کا پودا بہت ضروری تھا۔ سو ہا اس میں تمہارا عکس تھا۔ سو ہا میں نے تمہیں لمحوں کے بعد تمہارے عکس کو بھی کھو دیا ہے۔“

”سو ہا.....!! تم اس دنیا کی واحد انسان ہو جسے میں نے اپنے تمام تر جذبول کی شدت سے چاہا ہے۔“

”جذبول میں کوئی کھوٹ نہیں۔ پھر تم کیوں ایسے گم ہو گئی۔ میں تمہیں ڈھونڈوں گا۔ تمہیں اپناؤں گا۔ اس دنیا میں اگر تم سینکڑوں انسانوں کے بیچ میں بھی کھڑی ہو گئی تو میں تمہیں پہچان لوں گا۔ میں اپنا چہرہ تو بھول سکتا ہوں، مگر تمہارا نہیں۔“

”یہ پھر جو آج میں خالی ہاتھ ہوں، کیا میں آگے کی اسی طرح ناکام ہو جاؤں گا۔ سو ہا اگر میں زندہ ہوں

تو میں لے رہا ہوں، تو اسی لیے لے رہا ہوں کہ تم میری زندگی ہو۔ تمہاری چاہ میں میں زندہ ہوں۔ تم میری امید

کرن ہو۔ روشنی میں چمکنے والا ستارہ ہو۔ مگر مجھے یہ پتہ نہیں ہے۔ تم بھی مجھے چاہتی ہو۔ مجھے پیار کرتی ہو۔ تم خود

میں بیٹھا ہوا تھا۔ اور شوٹنگ اسپاٹ کی طرف جا رہا تھا۔ وہ بہت رف ڈرائیو کر رہا تھا، وہ آدھے گھنٹے میں شوٹنگ اسپاٹ پہنچ گیا تھا۔ سب نے اس کا بہت گرم جوشی سے استقبال کیا، مگر ہیروئن رمشال شاہ کے منہ کے زاویے بگڑے ہوئے تھے۔ اس نے جلدی سے چھینچ کیا۔ اور میک اب کرنے والے نے اس کا میک اپ کر دیا۔ زین اب کردار کے گیٹ اپ میں تھا۔ ہیروئن کے سر پر کسی نے چھتری تانی ہوئی تھی۔ وہ اسٹریڈی ٹیک پی رہی تھی۔ زین اس کے قریب دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے رمشال شاہ کو دیکھا۔ اس نے اپنے منہ کے زاویے بگاڑ دیے۔ اس نے زین کو نظر انداز کیا۔

”رمشال شاہ.....!! ٹیک پی رہی ہو؟“ اس نے دوستانہ لہجہ میں پوچھا۔

”دیکھ ہی رہے ہو۔۔۔!!“ رمشال شاہ نے ادا سے کہا۔ وہ زین کے ساتھ کام تو پورے تعاون سے کر رہی تھی، مگر وہ اس سے سخت ناراض تھی۔ وہ اس کی کسی بھی بات کا جواب دل سے نہیں دیتی تھی وہ زین پر اپنا دل بار چکی تھی۔ اور جب سے اس نے زین سے اظہار محبت کیا تھا۔ زین نے اسے صاف انکار کر دیا تھا۔ وہ یہاں کام کرنے آیا تھا محبت کرنے نہیں۔

”ہاں.....!! واقعی اندھا میں بھی نہیں ہوں۔“

زین نے کندھے اچکائے۔ رمشال شاہ نے دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ اس نے ٹیک سے ایک گھونٹ بھرا۔

”پھر بھی کیسی ہو؟ کو کیا ابھی بھی ناراض ہو؟“

زین کمال کا نو جوان تھا۔ اس نے رمشال شاہ کی بات نظر انداز کر دی۔ وہ جتنا بھی پریشان ہوتا، اپنی پریشانی کسی پر ظاہر نہیں کرتا تھا۔ وہ دوستانہ ماحول میں کام کرنے کا عادی تھا۔ اس لیے اس نے رمشال شاہ کا سرد مہر وہ یہ نظر انداز کر دیا۔

”ہاں.....!! میں تو ٹھیک ہوں۔ مگر مجھے تو تم ٹھیک نہیں لگ رہے ہو؟“ اس نے زین کے ہاتھوں کے خراشوں کو غور سے دیکھا۔ اس کی جلد سرخ ہو گئی تھی۔

”ہاں.....!! میں کچھ ڈسٹرب ہوں۔ میں بہت پریشان ہوں۔ مجھے کسی کی تلاش ہے۔ مگر میں اپنی پریشانی کسی سے بھی شہیر نہیں کرتا۔ مگر ہم اس سے پہلے ایسے دوست بھی تو تھے۔ تم ہمیشہ میری ہم مزاج رہی ہو۔ میری پریشانیاں بانپ لیتی ہو۔“ زین نے اس کو بغور دیکھا۔

”زین.....!! اس لیے تو مجھے تم سے محبت ہو گئی۔ مگر تم نے انکار کر کے میرا دل ہی تو زردیا۔“ اس نے قدرے اداسی سے زین کو جتایا۔

”رمشال.....!! اگر مجھے کسی سے محبت نہ ہوتی، تو میں کبھی تمہیں ناراض نہ کرتا۔ میں آل ریڈی کسی کو دل سے چاہتا ہوں۔ اس دنیا میں تم وہ واحد انسان ہو، جس سے میں اپنے مسئلے شہیر کرتا ہوں۔ میں کتنا بھی پریشان کیوں نہ ہو جاؤں، مگر کوئی میرے چہرے سے بھی کبھی اندازہ نہیں لگا سکتا کہ میں یا میرے اندر کیا چل رہا ہے۔ مگر سیرسلی میں آج کل شدید ڈپریشن ہوں۔ پھر بھی میں تمہیں اتنی وضاحت دے سکتا ہوں، اگر تمہارا موڈ میری وجہ سے خراب ہے یا تم میری وجہ سے اداس ہو گئی ہو تو تم مجھے دیکھو.....!! میں اپنے دونوں کان پکڑ کر تم سے سوری کر لیتا ہوں۔ مگر رمشال میں آل ریڈی کسی سے محبت کرتا ہوں۔ اگر میں کسی کو نہیں چاہتا تو تمہارا آفر پر غور کیا جاسکتا تھا۔“ زین نے اس سے کہا۔

”نو.....!! زین.....!! اگر میں ناراض تھی بھی تو اب ایسی کوئی بات نہیں.....!! کسی کو چاہتا یا کسی سے محبت کرتا یہ ہمارے بس میں ہے۔ مگر کسی کو پانا، یا وہ ہماری محبت کا جواب محبت سے دے۔ یہ ہمارے بس میں نہیں ہے۔“ رمشال نے زین کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”ہاں.....!! تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ یہ زندگی ہے۔ اس میں ایسا ہی ہوتا ہے۔“ زین نے اس کو دیکھا۔

”زین.....!! اگر وہ تمہیں نہ لٹی، تو تم میری طرف ہاتھ بڑھاؤ گے۔ میرا ہاتھ ہمیشہ تمہارا خطر ہے گا۔ میں تم سے ناراض تھی، مگر میری ناراضگی اپنی جگہ مگر میری محبت سدا تمہاری رہے گی۔ اور میں اگر غمگین رہی بھی، تو وہ تمہاری لیٹ آؤنگی وجہ سے کر رہی تھی۔“





بات ان کو پسند نہیں آئی، وہ میرے بڑے ہیں۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں۔ ان ہی کی بدولت ہوں۔ اگر آج میں انھیں چھوڑ دوں تو کل میرے بچے بھی مجھے ایسے ہی چھوڑ دیجئیں.....!! زین رو ہانسہ ہو گیا۔

”ارسل.....!! میں نے کب کہا کہ تم انکل کو میری خاطر چھوڑ دو۔ تم ان کے حقوق سے کبھی غافل نہ رہو، اور جو میرے حقوق ہیں ان سے بھی کوتاہی نہ کرو۔ میں نے کہہ دیا ہے، میں نے انکل کو معاف کر دیا ہے۔ بلکہ میں ان سے خود معافی مانگ لوں گی۔“

بس بیٹی بس.....!! آگے کچھ مت کہنا۔ میں نے تمہاری اور ارسل کی ساری باتیں سن لی ہیں۔ معافی تو مجھے تم سے مانگ لینی چاہیے۔ اچانک دروازے سے وہی سینئر اداکار اندر داخل ہو گئے۔ وہ زین کا باپ بنے تھے۔ اور دونوں کی گفتگو سن رہے تھے۔ ڈرامے کے سین کے مطابق وہ زین (ارسل) کے پیچھے کافی غصے میں آئے تھے۔ مگر دونوں کی گفتگو سن لینے کے بعد وہ شرمندہ سے ہو گئے۔

زود جاز.....!! بیٹا میں اپنے کئے پر بے حد شرمندہ ہوں، مجھے معاف کر دو۔“ اس نے دونوں ہاتھ رمشال شاہ کے سامنے جوڑ دیے۔

”ارے انکل.....!! یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ آپ نے بیٹی بول دیا۔ بس یہ میرے لیے کافی ہے۔ آج سے میں آپ کو انکل نہیں پاپا کہوں گی۔ آپ میرے پاپا ہیں۔ آپ آئندہ بھی مجھے کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔ آپ معافی مانگنے کے بجائے مجھے گلے لگائیں۔ اور سینئر اداکار نے اسے فوراً گلے لگایا۔

”ارسل بیٹا.....!! ادھر آؤ تم بھی میرے گلے لگ جاؤ۔ تم بھی تو میرے بیٹے ہو۔“ زین فوراً اس کے گلے جا لگا۔ باپ نے دونوں بچوں کو بانہوں میں بھینچ لیا۔ زود جاز اور ارسل نے تشکر بھری نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ دونوں کی آنکھوں سے جیسے چند آنسوں گر گئے۔ یہ تشکر کے آنسوں تھے اور یوں پیسی دی اینڈ ہو گیا۔ سین کے کلوز اپ کے بعد ڈائریکٹر نے تالیاں

بجانی شروع کر دیں۔ ڈائریکٹر کے تالیاں بجاتے ہی یونٹ کے سب ممبرز نے تالیاں بجانی شروع کر دیں۔ اکرام اللہ بے حد خوش نظر آ رہے تھے۔ کیونکہ سین پہلے ہی ٹیک میں مکمل ہو گیا تھا۔

”واؤ.....!! تم سب نے مہارت سے ایک ہی ٹیک میں سین مکمل کر لیا۔“ اکرام اللہ نے خوشی سے کہا۔ ”کیرہ کلوز اپ ہونے کی خوشی میں پوری یونٹ کے لیے آج کا ڈزیریری طرف سے ہے۔“ اکرام اللہ نے خوشی سے کہا تو سب یونٹ والے خوش ہو گئے۔ رمشال شاہ، سینئر اداکار کے ساتھ گپ شپ میں مصروف ہو گئی۔

”سر.....!! میں ضرور رک جاتا، مگر مجھے ایک بہت ضروری کام سے جانا ہے۔ اگر ٹیکسٹ ٹائم کوئی اسکرپٹ ہوا، تو میں دیکھ لوں گا۔ اور اگر کردار میری پسند کا ہوا تو پورے ڈیش بھی دے دوں گا۔“ زین نے اکرام اللہ سے اجازت چاہی، اس نے رکی سے جملے کہہ دیے، حالانکہ اس کا مزید کام کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

”تھینک یو سو مچ.....!! زین تم بہت اچھے ہو، حالانکہ تمہارا پچھلا سمنٹ ابھی تک رکا ہوا ہے مگر بہت جلد تمہیں مل جائے گا۔ جب بھی کوئی اچھا سا اسکرپٹ ملا۔ میں تمہیں بھیجو دوں گا۔ میرے ٹیکسٹ پلے میں تم ہی ہیرو ہوں گے۔“ اکرام اللہ کو زین کا کام پسند تھا۔ وہ غریب نہیں تھا۔ بیچ لیٹ ہونے پر بھی کچھ نہیں کہتا تھا۔

”تھینک یوسر.....!! اس نے اکرام اللہ سے ہاتھ ملایا۔ اور وہاں سے نکل گیا۔

☆.....☆.....☆

باہر اچھی خاصی شام ہو گئی تھی۔ رات کے سائے ہر طرف پھیل رہے تھے۔ دوبارہ وہ جیسے پرانا زین بن بیٹھا، وہ سوچ رہا تھا۔ اور صرف سو با کے بارے میں سوچنے لگ گیا تھا۔ اس کا دماغ جیسے ایک بار پھر ماؤف ہونے لگا تھا۔

کی۔ اور اپنے زخموں کی پرواہ کئے بغیر وہ آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔ مگر وہ جگہ خالی تھی۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا اور وہی ویران اُجھاڑ کانٹے دار جھاڑیاں تھیں۔ زین نے موبائیل کی مارچ کی روشنی ادھر ادھر ڈالی۔ وہاں کچھ خاص تبدیلی نہیں کی گئی تھی۔ گڑھا اب وہ مل نہیں رہا تھا۔ جس میں زین نے جلتے گلاب کا پودا دیکھ رکھا تھا۔ وہ جگہ بالکل ہموار تھی۔

”کیا میرے جانے کے بعد کسی نے مجھے گمراہ کرنے کے لیے وہ گڑھا بھرنے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے تو اب یہاں کوئی نرم زمین ہے ہی نہیں۔۔۔!!“

زین نے مارچ کی روشنی میں کئی بار زمین کا جائزہ لیا۔ واقعی ایسا ہی تھا۔ اس کے جانے کے بعد کوئی آیا تھا۔ اس نے وہ گڑھا مکمل طور پر بھر ڈالا تھا۔

”کوئی ہے۔۔۔!! جو مجھ پر گہری نظر رکھے ہوئے ہے۔ میرے ساتھ ہائیڈرائڈ سیکسکیمیل رہا ہے۔ میں بھی دیکھوں۔۔۔!! وہ کب تک چھپا رہ سکا ہے۔ میں بھی اب اس کو بے نقاب کر کے رہوں گا۔“

اس نے ہاتھ دوسرے ہاتھ پر مارا۔ اور وہاں سے واپسی کی راہ لی۔ اب اس کا موڈ بہت خراب ہو چکا تھا۔ وہ گھر جانا چاہ رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

زین نے کار گیراج میں کھڑی کی، اس نے کار سے قدم باہر اتارے۔ اور گھر کے اندرونی حصے کی طرف جانے لگا کہ اچانک اسے رکنا پڑا کیونکہ لان میں اس کی مام زرتاشہ کسی سے فون پر بات کر رہی تھیں۔ وہ ناچا ہے ہوئے بھی وہاں چلا گیا۔ زین کو اپنی طرف آتا دیکھ کر زرتاشہ نے اپنی ٹنگٹو ٹنگ کر کے ختم کر دی۔

”السلام علیکم مام“.....!! زین نے سلام کیا تو زرتاشہ نے سر ہلا کر جواب دیا۔

”زین.....!! مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔“

”مام.....!! کوئی خاص بات ہے؟“ وہ دام کے ساتھ ساتھ جلتے لگا۔

”سوبا.....!! جب تک تم نہیں مل جاتی، تب تک میں کوئی نیا پراجیکٹ نہیں لوں گا۔“ زین نے سڑک کی طرف دیکھا۔ اور اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے پاس بے شمار پراجیکٹس کی آفر تھیں، مگر وہ اب کسی میں آگے کام نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”ویسے بھی کوئی اسکرپٹ اسٹڈی کیا نہیں ہے، انکار کر کے جان چھوٹ جائے گی۔“ اس نے سر ہلایا۔ یہ سوچ اس کو مطمئن کرنے کے لیے کافی تھی۔ اب وہ گاڑی میں اسی ویران میدان کی طرف جا رہا تھا۔ جہاں اس نے جلتے گلاب کو دیکھا تھا۔ اور جس میں اسے سوبا کا عکس نظر آیا تھا۔

”کیا پتہ.....!! وہ جلتے گلاب کا پودا دوبارہ وہاں“ اس نے جیسے دل کو تسلی دی۔ اور گاڑی کی رفتار مزید بڑھا دی۔ وہ جیسے اپنے آپ میں نہیں تھا۔ اس لیے جلد سے جلد اسی میدان میں جانا چاہ رہا تھا۔

”سوبا.....!! مجھے سمجھ نہیں آ رہی ہے کہ میں تمہاری تلاش کہاں سے شروع کروں؟ میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے، کوئی ایک سرائیک نہیں ہے۔ جس سے میں شروع کر سکوں اور تم تک پہنچ جاؤں۔ میں اندھیرے میں ٹانگ ٹوئیاں مار رہا ہوں۔“ اس نے طریقے سے باہر سڑک پر دیکھا، اور گاڑی کی رفتار مزید تیز کر دی۔

”مجھے تم تک پہنچنے کے لیے ایک سرائیک چکا تھا مگر اسے میں نے کھو دیا۔ وہ جلتے گلاب غائب ہو چکے ہیں۔ پھر بھی میں اس امید پہ وہاں جا رہا ہوں۔“

”نہ مجھے تمہارا پتہ مل جائے۔“ وہ اب میدان کے کافی قریب پہنچ چکا تھا۔ رات کا اندھیرا پچھل چکا تھا۔ اور اب ۲ بج رہا ہو رہا تھا۔ زین نے سڑک کنارے گاڑی روک دی۔ اور گاڑی سے نکل کر اسی اندھیرے میدان میں اپنے جانا شروع کر دیا۔

اچانک اس کے پیر کانتوں میں پھنس گئے۔ اس کے ٹخنوں میں کانٹے بری طرح سے چھ گئے، اس نے جلدی سے موبائیل نکال کر مارچ روشن

”زین.....!! وہ صرف ماں کا دل ہوتا ہے، جو اولاد کی محبت میں مشکل سے مطمئن ہو جاتا ہے۔ اگر تم مجھے بتا رہے ہو تو بتادو۔ میں اب مزید کسی صورت دیری برداشت نہیں کر سکتی۔“

”جی مام.....!! آپ یہ بات ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ذرا بیٹھی ہے؟ مجھے بہت بھوک لگی ہے۔“ زین کو بھوک لگی تھی۔ اس نے اپنے مطلب کے لیے ساری بات کا رخ پلٹ دیا۔

”ہاں بیٹا!! میرا دل چاہ رہا ہے کہ تم میرے ساتھ آج سو با کی خوب باتیں کرو۔“ ماں لاؤنج میں صوفے پر براجمان ہو گئی۔ زین بھی ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔

”شٹا.....!!“ زین نے مام کو دیکھا، اور دونوں کندھے اچکا دئے۔

”یہی کہ سو با پہلی بار تم سے کب ملی۔ کیا وہ بہت پیاری ہے؟ جو پہلے ہی ملاقات میں تمہارا دل لے اڑی ہے۔ اور تم دونوں پہلی بار کیسے ملے؟“ مام کو باتوں میں اشتیاق تھا۔

”مام.....!! جب سو با آپ کی بہو بن جائیں تو یہ ساری باتیں آپ سو با سے پوچھ لیتا؟ وہ آپ کو ہر ایک بات بہتر انداز میں بتا دے گی۔ آپ دونوں کی دوستی بھی ہو جائیگی۔“

”زین.....!! دس ازناٹ فیر.....!! تم مجھے کچھ بھی نہیں بتا رہے ہو۔“ مام سلگ اٹھی۔

”مام.....!! میں واقعی آج بہت تھک چکا ہوں۔ کچھ دیر ریٹ کرنا چاہوں گا، جب ڈیڈ آ جاؤں تو میں ذکر کرنے آ جاؤں گا۔“ وہ اٹھا اور اپنے کمرے میں جانے لگا اور مام اپنے بیٹے کی پشت کو دیکھنے لگیں۔ وہ کچھ دیر گم صم رہیں پھر ”سو با جلتے گلاب میں کیسے مقید ہو گئی؟“

اس سوال کا جواب جلتے گلاب میں آئندہ ماہ ملے گا انشاء اللہ۔۔۔!!

”ہاں.....!! دراصل مجھے اب تمہاری شادی کرنی ہے۔ اس دن تم نے کسی لڑکی کا ذکر کیا تھا۔ اس کا نام سو با بتایا تھا۔ میں اس سے ملنا چاہتی ہو۔ اب تمہاری شادی کی عمر ہے۔ میں یہ کام مزید لیٹ نہیں کر سکتی۔ میں اپنی یہ خواہش جلد سے جلد پوری کرنا چاہتی ہوں۔“

”مام.....!! آریو پیرس.....!! اس نے مام کی طرف پیار سے دیکھا۔

”دیکھو.....!! اب میں کچھ نہیں جانتی؟ سو با رہتی کہاں ہے؟ کس کی بیٹی ہے؟ مجھے تم اس کا پتہ بتادو۔ میں کل ہی اس کے گھر جا کر تمہارے لیے مانگ لوں گی۔ جب تم نے اپنی پسند بتائی تو میرے بے چین دل کو کبھی قرار آ گیا۔ اب میں کوئی ایسا سکینڈ نہیں سنوں گی۔“

مام نے زین کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

”مام.....!! ابھی میں نے سو با سے ایسی کوئی بھی بات نہیں کی۔ وہ ان دنوں پڑھائی کے سلسلے میں ملک سے باہر گئی ہے۔ جیسے ہی وہ مجھے ملتی ہے۔ سب سے پہلے میں اسے آپ سے ملواؤں گا۔ اب میں بھی مزید دیر نہیں کرنا چاہتا۔“ زین مام کے ساتھ گھر کے اندر دنی جے میں آچکا تھا۔ مام نے اسے حیرت سے دیکھا۔ کیونکہ اس کو زین کی بات کا یقین ہی نہ آیا۔

”زین.....!! تمہاری تو اس سے موبائیل پر رابطہ ہوتا ہوگا۔ تم مجھے وہ موبائیل پر بھی دکھا سکتے ہو۔ آج کل موبائیل نے فاصلے سمیٹ لیے ہیں۔“ زین نے اسے حیرت سے دیکھا۔

”مام.....!! میں ابھی اس کی اسٹڈی ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا۔ اور ابھی آپ کو اس کے لیے انتظار کرنا ہوگا۔“ اس نے مام کی طرف دیکھا۔

”زین.....!! تم جو بتا رہے ہو، مجھے لگ رہا ہے۔ تم جان چھڑا رہے ہو۔ میرا دل مطمئن نہیں ہو رہا ہے۔“ مام نے اسے شک بھری نظروں سے دیکھا۔

”آپ ماں بن کے سوچ رہی ہیں۔ آپ کا دل اس لیے مطمئن نہیں ہو رہا ہے۔“ زین نے ماں کی بات کو بیکے انداز میں رد کیا۔



# جلتے گلاب

عثمان غنی خان - پشاور

قسط نمبر: 2

دو دلوں کا ملاپ اچانک چھناکے سے بکھر گیا، دونوں کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اس قدر عجلت میں وہ ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گے اور جب ایسا ہوا تو ایک انوکھا شاخسانہ سامنے آیا تو انجان سفر کے باسی گھٹ کر رہ گئے لیکن جب وقت پلٹا تو.....

ایک اچھوتی انوکھی دلک و لنواز، فرحت بخشی دل دماغ کو لگداتی شاہکار کہانی

سوبا سے یہی سارے سوالات پوچھ لوں۔ اس کی عجیب منطق ہے۔“ زرتاشہ نے ابرار احمد کی طرف دیکھا۔  
”زین نے ایسا کہا“.....!! ابرار نے بیوی کی طرف غیر یقینی سے دیکھا۔ جیسے اسے شک لگا ہو۔  
ہاں بالکل.....!! یہی کہا تھا۔ ابرار تم سوبا کو جانتے ہو۔“ زرتاشہ نے گہری نظروں سے ابرار کو دیکھا۔  
”نہیں.....!! میں نے کسی سوبانامی لڑکی کو اپنے پورے سوشل سرکل میں کہیں نہیں دیکھا۔ میں تو زین کی شادی کسی لینڈ لارڈ خاندان میں کروانا چاہ رہا ہوں۔ جس کا سیاست سے گہرا رشتہ ہو۔ اگر زین سوبا سے ہی شادی کرنا چاہتا ہے، تو اس کی پسند پر میں دل سے راضی ہوں۔“ ابرار نے دھیمے لہجے میں کہا۔

”ابرار.....!! مجھے ایسا لگتا ہے کہ کوئی سوبانام کی لڑکی سرے سے ہے ہی نہیں، ورنہ زین ابھی تک اس کے گھر والوں کے بارے میں سب کچھ بتا چکا ہوتا۔ میرے خیال میں وہ وقت مانگ رہا ہے۔“ زرتاشہ دل کا خیال ابرار کے سامنے پیش کیا۔

”اگر ایسا ہے، تو بہت اچھا ہے۔ میں بھی اس کی پسند سے راضی نہیں ہوں۔“ ابرار نے فوراً کہہ دیا۔  
”آپ کے تاثرات پہلے ہی بتا رہے تھے کہ

**ابرار** بریف کیس ہاتھ میں لیے وہاں آگئے، زرتاشہ کسی خیال میں کھوئی ہوئی لگ رہی تھی۔ ابرار نے گلے کھٹکارا۔ زرتاشہ اسے دیکھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے اس کے ہاتھ سے بریف کیس لے لیا اور اس کے کندھے سے کوٹ اتار لیا۔ اب زرتاشہ کے ہاتھ میں فولڈ کیا ہوا شانگ کوٹ اور بریف کیس تھا۔ ابرار اور وہ ایک ساتھ اپنے کمرے میں جانے لگیں۔

”ابرار کیا بہت تھک گئے ہیں؟ جو یوں ڈسٹر جب لگ رہے ہیں۔“ زرتاشہ نے کوٹ الماری میں ہانک دیا۔  
”کیا زین گھر پر ہے؟ میں بالکل بھی نہیں تھکا۔ بس کچھ اپنی پریشیاں ہیں۔“  
”ہاں.....!! ابھی ابھی آیا ہے۔ آپ سے کچھ دیر پہلے ہی گھر پہنچا ہے۔“

”تھیک ہے، تمہاری زین سے کیا بات ہوئی اس نے کیا کہا؟ سوبا سے تمہیں کب ملوار رہا ہے؟“  
”ہاں.....!! بات ہو گئی ہے، کہا ہے کہ جلد ملواؤں گا۔“  
”مگر مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سوبا ابھی ملک سے باہر ہے۔ صاف بات بنا نہیں رہا ہے۔ میں نے اس سے سوبا کے متعلق سوالات پوچھ لیے۔ مگر کچھ بھی نہیں بتایا۔ کہا جب سوبا سے میری شادی ہو جائے گی تب میں



”زین“.....!!

”مام.....!! آپ آئیے نا.....!!“ زین نے  
موبائل بند کر کے جیب میں رکھ دیا۔  
”تمہارے ڈیڈ آگئے ہیں۔ آجاؤ ساتھ ڈنر  
کرتے ہیں۔“

”اچھا آپ جائیں۔ میں آ رہا ہوں۔“ زین نے  
مام سے کہا۔ وہ بھی اُٹھ گیا اور واش روم میں گھس گیا۔ وہ  
منہ ہاتھ دھونا چاہ رہا تھا۔ اب وہ باہر لاؤنج میں جا رہا  
تھا۔ وہ سب کرسیوں پر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے  
ہوئے بات چیت کرتے لگے اور کچھ دیر میں ملازم کھانا سرو  
کرنے والے تھے۔ تب تک وہ ادھر ادھر کی باتیں کرنے  
لگے۔ ڈنر کرنے کے بعد زین اپنے کمرے میں چلا گیا اور  
لیٹ گیا، مگر نیند اس کی آنکھوں سے گوسوں دور کھڑی تھی۔

☆.....☆.....☆

زین بالکل غم صم سا لیٹا ہوا تھا، اس نے اپنا  
موبائل نکالا اور وہی ویڈیو کلپ لے کر دیا۔ وہ کلپ وہ  
بہت غور سے دیکھنے لگا۔ جیسے ہی اسکرین پر جلتے گلاب  
میں سوہا کا عکس دکھائی دیا۔ اس نے وہاں پر ویڈیو  
puese کر دیا۔ اب موبائل اسکرین پر گلاب کے  
پھول میں آگ کے شعلے ابھر رہے تھے اور اسی میں سوہا  
کا عکس بھی نظر آ رہا تھا۔ زین نے اس ویڈیو کلپ کا  
اسکرین شارٹ لیا اور اس کو اپنے موبائل کے ڈسپلے پر  
چھوڑ دیا۔ اب وہ ایک بہت خوبصورت وال پیپر لگ رہا  
تھا۔ ایک ایسا منظر جسے کسی نے ایڈیٹ کیا ہو۔ زین کتنی  
دیر تک اس منظر میں کھویا رہا۔

”سوہا.....!! آج میں نے تمہارا ذکر مام سے  
کیا۔ مام بھی ہماری شادی سے خوش ہو گئی ہے۔“ وہ کچھ  
دیر موبائل اسکرین کو دیکھتا رہا۔

”انشاء اللہ.....!! تم دیکھنا، ہم اب جلد سے جلد  
ملیں گے اور میں اس بات پر سنجیدگی سے غور و فکر کر رہا  
ہوں جو کوئی بھی ہمارے درمیان ہے۔ وہ اب خود بخود  
نکل جائے گا۔ میں اسے چھوڑ دوں گا نہیں۔“ اس نے  
سوہا کا عکس ہونٹوں سے لگایا۔

زین کی مرضی پر آپ دل سے خوش نہیں ہیں۔“ زرتاشہ  
اس کی شریک حیات تھی۔ اس کا چہرہ دیکھ کر سمجھ جاتی تھی۔  
ابھی بھی اس نے کاچہرہ دیکھ کر درست اندازہ لگایا۔  
”کیا تم اس سب پر دل سے خوش ہو۔“ ابرار  
نے اُنکا اس سے سوال کیا۔

”نہیں.....!! مگر کبھی کبھار اولاد کی خوشی میں ہی  
اپنی خوشی ہوتی ہے اور میں زین کی خوشی میں خوش ہو جاؤں  
گی۔“ زرتاشہ اس سے نظریں چراتے ہوئے بول پڑی۔  
زرتاشہ خوش نہیں تھی۔ مگر اس کے چہرے کے تاثرات اس  
کے چہرے سے ابرار کی طرح عیاں نہیں ہو رہے تھے۔  
”تم ماں ہونا۔ تم کہہ سکتی ہو۔ مگر تم بھی زین کی  
اس بات سے خوش نہیں ہو۔ جیسے میں خوش نہیں ہوں۔  
جس طرح تمہارا دل چاہتا ہے کہ اپنی مرضی سے اپنی  
پسند سے زین کی شادی کروں۔ اس طرح ایک باپ کا  
دل بھی چاہتا ہے کہ میں اس کی شادی اپنی پسند اور مرضی  
سے کروں۔“ ابرار آخر میں مسکرانے لگا۔

”ابرار.....!! ایسا اب مت کہیں، کیا ہمارے  
لیے اتنا کافی نہیں ہے کہ زین شادی پر راضی ہو گیا ہے۔  
چاہے وہ یہ شادی اپنی ہی پسند سے کیوں نہ کر رہا ہو؟  
اب میں اس کو نہیں روکوں گی۔ اگر وہ محبت کی شادی کرنا  
چاہتا ہے۔ تو والدین کے فرائض میں ایک فرض یہ بھی  
ہے۔ وہ اولاد کی شادی ان کی پسند سے کر دیں۔“  
زرتاشہ نے ابرار کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”ہاں.....!! تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اب میں بھی  
اسی پر سنجیدگی سے سوچ رہا ہوں۔ آؤ باہر چلیں۔ آج  
رات کا ڈنر ہم باہر کرتے ہیں۔ زین کو بھی بلاؤ۔“ ابرار  
نے زرتاشہ کا موڈ چنبچ کرنا چاہا۔

”نہیں ابرار.....!! آج رات گھر پر بھی میں نے  
خاص اہتمام کیا ہوا ہے۔ ہم کچھ بھی باہر ڈنر کر لیں گے۔“  
”واہ.....!! تو پھر بلاؤ زین کو ڈنر کر لیتے ہیں۔“  
ابرار نے مائی نکالی۔ زرتاشہ زین کو بلانے کے لیے اس  
کے کمرے میں چلی گئی۔ وہ پلنگ کے محراب سے ٹپک  
لگائے اپنے موبائل میں کچھ غور سے دیکھ رہا تھا۔

سوبا کے چہرے پر انتہائی خوفناک تاثر تھا۔ وہ اس ویران سنان سی جگہ میں اکیلی تھی۔ رات کا منظر تھا۔ دور دور تک آسمان پر آوارہ بادل پھیلے ہوئے بہت وحشت ناک لگ رہے تھے۔ ستارے بادلوں کی اوٹ میں فنا ہو گئے تھے اور چاند کہیں پر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ گھپ اندھیرا تھا۔ مگر سوبا کے ارد گرد روشنی کا گول حالہ تھا۔ جس میں اس کا وجود صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ بے شمار تحیم دیو ہیکل درخت اس اندھیرے کو ڈراؤنا بنانے کے لیے کافی تھے۔ اتنے میں کسی انوکھی کرپہہ آواز نے ماحول کو مزید دہشت زدہ کر دیا۔ سوبا سفید لباس میں بنا دوپٹے کے کھڑی تھی۔ اس کا دل کانپ رہا تھا۔ پورا وجود سرد ہواؤں سے سن ہو کر رہ گیا تھا۔ اچانک اس نے بنا سوچے سمجھے دوڑنا شروع کر دیا۔ اندھیرے میں اس کا خوبصورت چہرہ زرد لگ رہا تھا۔ آگے بڑا قبرستان تھا۔ اس نے بنا سوچے سمجھے قبرستان کے زنگ الود گیت کو پار کر دیا۔ آگے بے شمار قدیم قبریں تھیں۔ سوبا قبروں کے اوپر بھاگنے لگی، اس کے انداز میں وحشت سی تھی۔ جیسے وہ کہیں پناہ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی ہو۔ اچانک ماحول میں گیڈر کی بھیانک آواز سنائی دی اور سوبانے مڑ کر دیکھا۔ اس کا چہرہ جیسے خوف سے نچڑ گیا تھا۔ ایک پرانی قبر میں بے خیالی میں اس کا پیر دھنس گیا۔ اس نے پیر نکالنے کی بے حد کوشش کی۔ مگر بے سود وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کے بال چڑیا کے گھونسلے کی طرح ایک دوسرے سے الجھ کر رہ گئے تھے۔ اچانک اسی قبر سے کسی انسان کا ہاتھ باہر نکلا۔ اور اس نے سوبا کا پیر پکڑ لیا۔ اس کا پاؤں پہلے ہی قبر کی مٹی میں دھنس چکا تھا۔ اس نے بھیانک چیخ ماری۔ چیخ مارتے ہی اس کا پیر اس انجانے ہاتھ سے آزاد ہو گیا۔ وہ قبرستان سے باہر آنے کے لیے ڈورنے لگی۔ وہ اس کوشش میں کئی بار گری، پھر اٹھی۔ خود کو لڑکھڑاتے قدموں سے سنبھالتی اور پھر سے ڈور پڑتی۔ سامنے قبرستان کے گیٹ کے قریب کہیں دیرانے سے کرپہہ

”سوبا.....!! میرے پاس بھی جادو ہوتا۔ میں جادو سے تمہیں اس گلاب سے آزاد کر دیتا اور جس نے تمہارے ساتھ ایسا کیا ہے۔ اس کو اپنے جادو سے جلا کر خاکستر کر دیتا۔ میں تمہیں اس جادوئی گلاب سے نکال کر اسی کو اسی جادوئی گلاب میں مقید کر لیتا اور تمہیں دکھاتا کہ دیکھو محبت کے دشمن کا انجام ایسا ہوتا ہے۔“ اس نے سوبا کے عکس سے تصویر میں باتیں کرنی شروع کر دیں۔ اسے یہ پاگل پن اچھا لگ رہا تھا۔

”میں تم تک آنے کے لیے ہر مشکل راہ سے گزر جاؤں گا۔ اگر مجھے تمہارے ساتھ اسی جلتے گلاب میں مقید ہونا پڑے، تو بھی میں قید ہو جاؤں گا۔ تم مجھ سے بدگمان نہ ہونا۔ میں ایک لمحے کو بھی تم سے غافل نہیں ہوا ہوں۔ میں مجبور ہوں، بے بس ہوں۔ مگر میرا دل آج بھی صرف تمہاری محبت میں دھڑکتا ہے۔ آج بھی جب میں تمہارا نام لیتا ہوں، تو میری دھڑکنیں بے ترتیب ہو جاتی ہیں۔ میرے چہرے پر رنگوں کی بھار چھا جاتی ہے۔ میرا دل بار بار تمہارا نام لیتا ہے۔ اللہ سے ہر دعائیں تمہاری سلامتی کی دعائیں مانگ کر مجھے سکون ملتا ہے۔ میں دل سے تمہارے لیے ہی توجی رہا ہوں۔“

اس نے دونوں آنکھیں بند کر دیں۔

”سوبا.....!! سوبا.....!! سوبا.....!! اکیکھو اگر آج تم میرے سینے پر سر رکھ کر میری دل کی دھک دھک سنو۔ تو وہ دھک دھک بھی تمہارے نام کی ہوگی۔ میرے دل کی ہر سانس تمہارے آس پر جی رہا ہے۔ میں اگر زندہ ہوں۔ تو مجھے اتنا پتہ ہے کہ تم بھی زندہ ہو۔ تم اسی دنیا میں کہیں نہ کہیں موجود ہو۔ میں جانتا ہوں کہ ہماری یہ جدائی وقتی ہے۔ میں تم سے جس دن ملوں گا۔ اپنی ان بے چینیوں سے تمہیں آگاہ کر دوں گا۔ میں تو سانس لینا ہی چھوڑ دیتا، اگر مجھے اس بات کا ذرا سا بھی احساس ہو جاتا کہ تم اس دنیا میں کہیں نہیں ہو۔“ اس نے کتنی دیر خود سے باتیں کیں اور پھر دھیرے دھیرے اس پر بھی قدرت مہربان ہو گئی۔ اس کی آنکھیں بند ہوئی گئیں۔

☆.....☆.....☆



صورت۔ بھیڑیا آکھڑا ہوا۔ وہ سوہا کو دیکھتا رہا۔ اور پھر جست لگا کر سوہا کی طرف دوڑ پڑا۔ سوہا خوف سے اس درندے جانور کو دیکھ کر اپنی جگہ کانپ کر بالکل ساکت کھڑی ہو گئی۔ جوں جوں وہ خوشخوار جانور سوہا کے قریب بڑھ رہا تھا۔ توں توں سوہا ڈر سے جیسے کانپ رہی تھی۔ سوہا نے بے خیالی میں ایک بار پھر دوڑ لگا دی۔ اب وہ آگے تھی۔ اور اس کے پیچھے وہ خونی درندے تھے۔ ان کے درمیان فاصلہ رفتہ رفتہ کم پڑ رہا تھا۔ ایک بھیڑیے نے جست لگا کر سوہا کو پکڑنے کے لیے چھلانگ لگا دی۔ آگے ایک پرانا کنواں تھا۔ بے خیالی میں سوہا اسی گڑھے نمائکوں میں گرتی چلی گئی۔ وہ بھیڑیے کے شکنجے میں آنے سے توجّہ گئی۔ مگر وہ کنوئیں میں گر گئی۔ اس کے منہ سے گرتے وقت ایک ہی آواز نکل رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

”سوہا...! سوہا...! سوہا...! زین ہڑبھڑا کر اٹھ گئے۔ جاگتے وقت اس نے سب سے پہلے سوہا کا نام پکارا تھا۔ سوہا نام کی گونج ابھی بھی اس کے کمرے کے در و دیوار سے صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ سخت پسینہ ہو گیا تھا۔ وہ جیسے پسینے میں شرابور تھا۔

”او میرے خدا!...!! تہ۔۔۔ تہ۔۔۔ تو یہ خواب تھا۔ اتنا بھیانک خواب۔۔۔!! کہیں سوہا کسی بڑی مشکل میں نہ ہو اور اس کو میری مدد کی ضرورت ہو اور وہ مجھے پکار رہی ہو۔“ زین اٹھ گیا۔ وہ پہلے واش روم میں گھس گیا۔ اس نے منہ پر کٹی بار پانی کے جھپکے مارے۔ تب وہ کچھ ہوش میں لوٹ آیا۔ اب وہ بہتر محسوس کر رہا تھا۔ وہ بے چینی جو اس کے دل کو ہو رہی تھی۔ اس نے کئی گہری سانس لیں۔ بے ساختہ اس کی نظریں وال کلاک پر ٹھہر گئیں۔ رات کے ساڑھے بارہ بج گئے تھے۔ وہ اپنے کمرے سے باہر نکلا۔ اس نے لان میں اپنے باپ ابراہیم کو بے چینی سے ٹپکتے ہوئے دیکھا۔ وہ اپنی جگہ کھڑا رہ گیا۔ ابراہیم ٹہل ٹہل کر جیسے

خود کو بلکان کر رہے تھے۔ اس کے ایک ایک قدم سے بے چینی عیاں ہو رہی تھی۔

”ڈیڈ!...!! اس وقت کیا کر رہے ہیں اور اس کے انداز میں کتنی بے چینی ہے۔ کیا اس کو بھی کوئی پریشانی ہے؟ یقیناً ڈیڈ کی کوئی برنس پرابلم ہوگی۔“ زین نے سوچا۔ وہ کچھ دیر ڈیڈ کو دیکھتا رہا۔ اچانک ابراہیم گرجا کی طرف جانے لگے۔ زین نے بھی کئی قدم اٹھا لیے۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ ڈیڈ اس وقت کہاں جا رہے ہیں؟ ابراہیم احمد نے اپنی نئی ہنڈا سوک کار نکالی۔ اب گاڑی مین گیٹ کی طرف جا رہی تھی۔ وایج مین نے صاحب کی گاڑی دیکھی، تو مستعدی سے گیٹ کھول دیا۔ اب گیٹ سے گاڑی باہر جا رہی تھی۔ زین جلدی سے اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ وہ بے حد پریشان ہو چکا تھا۔ اس کو ڈیڈ کے پیچھے جانا تھا۔ وہ اپنی گاڑی نکال چکا تھا۔ اب اس کی گاڑی گیٹ سے نکل رہی تھی۔

”ڈیڈ!...!! اس وقت کہاں جا رہے ہیں۔ مجھے اس کے پیچھے جانا چاہیے۔ یقیناً کوئی ایمر جنسی ہو گئی ہے۔ تبھی ڈیڈ بتاتے ہیں پریشان نہیں کرنا چاہا رہے ہیں۔“ زین نے گاڑی سڑک پر ڈالتے ہوئے سوچا۔ اس کو کافی فاصلے پر ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس نظر آ گئی۔ سڑکوں پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ زین کو لگا یہی ایک گاڑی ابراہیم احمد کی ہے۔ اس نے اس کا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔ وہ گاڑی ہائی وے کی طرف جا رہی تھی۔ وہ اچھے خاصے فاصلے سے ڈیڈ کی گاڑی فالو کر رہا تھا۔ گاڑی اسی میدان کی طرف جا رہی تھی۔ جہاں زین کی دفعہ گیا تھا ڈیڈ کی گاڑی اسی میدان کے پاس جا رہی تھی۔ جہاں زین نے جلتے گلاب کو دیکھا تھا۔ زین کو حیرت ہو رہی تھی۔ زین بھی کافی فاصلہ رکھ کر گاڑی روک چکا تھا۔ زین نے احتیاط کے طور پر اپنی گاڑی کی ہیڈ لائٹس بند کر دی۔ اس جگہ ویرانی کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ ابراہیم احمد گاڑی سے باہر نکلے اور اسی میدان کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ زین کو چیرائی کے سوا کچھ نہیں ہو رہا تھا۔ ابراہیم احمد کی گاڑی اشارت تھی، اس کی بیک لائٹس روشن نظر آرہی تھی۔ زین بھی اپنی گاڑی سے اتر آیا۔

تھا۔ دوسری طرف زرد رنگ کی روشنی پھیلنے لگی۔ جیسے کسی نے مشعل جلائی ہو۔ کوئی اسی طرف آ رہا تھا۔ مگر وہ جو کوئی بھی تھا۔ بہت آہستہ تھا۔ وہ ابھی بہت دور تھا۔ اندھیرے میں صرف آگ کی روشنی نظر آ رہی تھی۔ اب قدرے وہ روشنی کچھ دیر بعد واضح ہو گئی۔ وہ زرد رنگ کی روشنی اب پھیل رہی تھی۔ وہ ایک نہیں دو آدمی تھے۔ ان کی صحت قدرے لا جواب تھی۔ جس نے ہاتھوں میں کوئی بہت بڑا گلاب پکڑ رکھا تھا۔ اس گلاب کو دونوں اطراف سے ان آدمیوں نے پکڑ رکھا تھا۔ اسی گلاب میں وہ جلتے گلاب کا پودا تھا۔ اور جس سے آگ کے شعلے ابھر رہے تھے۔ زین اس پودے کو دیکھ کر بے قابو سا ہو گیا۔ وہ ان لوگوں کو اب واضح طور پر دیکھ سکتا تھا۔ وہ ابرار کے بالکل سامنے رک گئے۔ ابرار کی نظروں میں اشتیاق تھا۔ وہ مسکرا رہے تھے۔

”ویلڈن.....!! ویلڈن.....!! ابرار کی آواز زین کو سنائی دی۔ وہ پر جوش سا کہہ رہے تھے اور زین کے ذہن میں جیسے دھماکے ہو رہے تھے۔ یا جیسے کسی نے اس کو چلتی ٹرین کی پٹری پر لٹا دیا ہو اور ٹرین پوری رفتار سے اس کے اوپر سے گزر گئی ہو۔ اس کے چہرے پر ارد گرد اڑ گئے ہوں۔ وہ صدمے سے جیسے بیٹھ گیا تھا۔ اس کو اندھیرا دکھائی دے رہا تھا۔ ابرار تالیاں بجا رہے تھے۔ وہ جلتے گلاب کو دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

وہ دو آدمی تھے، صحت مند وجود کے مالک تھے، وہی دونوں اندھیرے میں مخالف سمت میں آرہے تھے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں جلتے گلاب کا وہی پودا تھا، وہ دھڑ دھڑ جل رہا تھا۔ اسی کی روشنی میں ان کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ زین اس کو دیکھ کر بے قابو سا ہو گیا تھا، وہ اٹھنے والا تھا، مگر رک گیا۔

”آخر یہ لوگ کرتے کیا ہے؟“ زین نے خود سے کہا۔ اور رک کر ان کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ دونوں ابرار کے بالکل قریب آ گئے تھے۔ زین ان کی آواز میں سن سکتا تھا، اگر وہ لوگ آپس میں بات چیت کرتے تو وہ ان کے اتنے قریب تھا کہ با آسانی ان کی آوازیں سن سکتا

وہاں روٹ لائٹس نہ ہونے کے برابر تھے۔ جو ا کا دکا تھے وہ صحیح طریقے سے جل نہیں رہے تھے۔ زین بھی اندھیرے میں میدان کی طرف بڑھنے لگا۔ زین کو شدید قسم کا تجسس ہو رہا تھا کہ آخر معاملہ کیا ہے؟ ڈیڈ کیوں اس ویران میدان میں آ گئے ہیں۔ جہاں کانٹوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے اور حشرات الارض کی چیخنی آوازوں کے علاوہ کوئی آواز نہیں ہے۔ ابرار نے نارنجی روشنی کر رکھی تھی۔ وہ اسی جگہ جا رہے تھے، جہاں زین کو جلتے گلاب کا پودا ملا تھا۔ اب وہ اسی جگہ کھڑے تھے۔ جیسے اس جگہ کا جائزہ لے رہے ہو۔

”ڈیڈ.....!! اس جگہ کیا کر رہے ہیں؟ کیا ڈیڈ کا کوئی تجربہ ہے، جس نے اسے بتایا تھا کہ میں اس جگہ آتا رہا ہوں۔“ زین دل ہی دل میں بولا۔ مگر وہ دیکھے قدموں سے ابرار کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اندھیرے میں اسے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس وجہ سے اس کے پیروں میں کئی بار کانٹے پیوست ہو گئے، مگر وہ ہر تکلیف سہتا رہا۔ اس نے منہ سے کوئی آواز تک نہ نکالی۔

”کیا ڈیڈ نے بھی یہاں جلتے گلاب کا پودا دیکھا تھا، جس میں سوہا کا عکس نظر آ رہا تھا۔ کہیں ڈیڈ اس کی تلاش میں تو یہاں نہیں آئے ہیں؟ پتہ نہیں یہ سب میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ میں کس چکر میں پھنس رہا ہوں؟ مگر میں اب ان سب کا پتہ لگاؤں گا۔“ وہ جھاڑیوں کے بیچ ہی بیٹھ گیا۔ کئی کانٹے اس کے پیٹھ میں بڑی طرح سے چبھ گئے، مگر اس نے اُن تک نہ کی۔ ایک سوچ نے اس کا خون مُنجد کر دیا۔

”کیا میرے اور سوہا کے درمیان کہیں ڈیڈ تو نہیں ہیں۔“ اس سوال نے جو اس کے دماغ نے اس سے کیا تھا۔ وہ تھر تھر کانپ اٹھا۔

نہیں۔۔۔ نہیں ایسا نہیں ہے، یہ سب محض ایک اتفاق ہے۔ ڈیڈ ایسے نہیں ہیں۔ ڈیڈ ایسا کیوں چاہیں گے، وہ میرے خوشیوں کے دشمن نہیں ہو سکتے۔ تو سوہا کو جانتے تک نہیں ہیں۔ ابھی زندگی میں اس سے ملے تک نہیں ہیں۔“ اس نے اپنے آپ کو مطمئن کرنے کے لیے واؤنڈیشن کیا۔ حالانکہ یہ خیال ہی اس کے لیے سوہاں روح

تھا۔ اچانک زین کے کانوں میں ابرار کی آواز سنائی دی۔  
 ”ویلڈن.....!! ویلڈن.....!!“ ابرار پر جوش  
 سے انداز میں کہہ رہے تھے۔ زین جیسے دھماکوں کی ضد  
 میں کھڑا تھا۔ اس کو حیرت ہو رہی تھی۔ کیونکہ اس کے  
 سامنے جو کھڑا شخص ویلڈن، ویلڈن کی بکواس کر رہا  
 ہے، یہ تو اس کے جان سے بھی پیارے ڈیڈی ہیں اور وہ  
 اس کی خوشی کی خاطر کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ مگر پھر وہ ایسا پر  
 جوش کیوں ہو گیا ہے۔ زین کو کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا۔  
 ”نن۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ یہ میرے ڈیڈی نہیں ہو  
 سکتے، کیوں کرینگے ڈیڈی ایسا۔۔۔ کیا وہ بھی اس اصول چلتے  
 گلاب کو چانتے تھے اور ڈیڈ کو پہلے سے سب کچھ معلوم  
 تھا۔ یہ بانی لوگوں کے لیے صرف ایک معمولی سا چلتے  
 گلاب کا پودا ہوگا۔ مگر میرے لیے یہ میری متاع جان  
 ہے۔ کیونکہ اسی میں سوہا کا عکس مقید ہے اور وہ مجھے اپنی  
 جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔“ زین نے دل ہی دل میں  
 خود سے کہا۔ وہ بری طرح سے پسینے میں نہا چکا تھا۔ وہ دل  
 ہی دل میں گھبرا رہا تھا۔ وقت بنے اس کو اپنے ڈیڈ کے  
 سامنے لا کھڑا کیا تھا۔ زین یقین تو کیا کبھی سوچ بھی نہیں  
 سکتا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے تو وہم و گماں میں  
 بھی نہیں تھا کہ ابرار اس جگہ موجود ہو سکتا ہے، زین کہنے  
 کانوں میں ان کی آوازیں اب آنے لگی تھیں۔  
 ”تم لوگوں نے بہت بڑا کام کیا ہے۔ میں بھی  
 اب تنگ آ چکا ہوں، لمبے عرصے سے ان لڑکی کا ذکر نہیں  
 سنا تھا، تو دل کو ایک تسلی سی مل گئی تھی۔ سوچ لیا تھا، دوبارہ  
 اس لڑکی کا نام کبھی زندگی بھر سننا نہیں پڑے گا، اس لڑکی  
 کو کتنی مشکلوں سے اپنے بیٹے کی زندگی سے گم کیا تھا۔  
 اب پھر سے یہ زین کی نظر میں آ گئی ہے۔ وہ پھر سے اس  
 کا نام لینے لگا ہے۔ میں ایسی گھٹیا اور بیچ خاندان کی لڑکی  
 سے کبھی بھی زین کی شادی نہیں کروں گا۔ بھلا کہیں نمل  
 میں ٹاٹ کا پیوند لگ سکا ہے۔“ ابرار احمد نے اپنے  
 خیالات ابھار دیے اور زین کو لگا کہ وہ خیالات نہیں ایک  
 طوفان ہے جو اسے اڑا کر لے جا رہا ہے۔ اس طوفان  
 نے جیسے اس کے پر نیچے اڑا دیئے تھے۔

”سائیں.....!! اب آپ کا کیا حکم ہے۔“ ان  
 دونوں میں سے ایک نے نہایت ادب سے پوچھا۔  
 ”یہ پودا اب مجھ جانا چاہیے، یہ کس طرح سے  
 مجھ سکتا ہے؟“ ابرار نے نو واردوں سے پوچھا۔  
 ”اس کو سمندر برد کر دیں، یہ گلاب کا جلتا پودا مجھ  
 جائے گا اور وہ لڑکی بھی مر جائے گی۔ کیونکہ اس کا سایہ اس  
 جلتے گلاب کے اندر قید ہے۔ وہ لڑکی ابھی تک اسی حال  
 میں ہوگی۔ وہ زندہ لاش ہے۔ نہ مردوں میں شمار کی جاسکتی  
 ہے، نہ زندوں میں، اس کا کوئی مقام نہیں ہے۔ اس  
 پودے کو اگر زمین میں دفن کر دیا جائے، تو اس کی روح کو  
 آزادی مل جائے گی وہ لڑکی ٹھیک ہو جائے گی۔ زین  
 بابا.....!! کو یہ جلتا گلاب کا پودا اس لیے دکھائی دیا تھا کیونکہ  
 وہ سوہا سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔ سوہا کا جلتا عکس صرف  
 وہی دیکھ سکتا ہے، جو اس کا پریمی ہو۔ ورنہ کافی عرصے سے  
 یہ گلاب کا پودا اسی میدان میں تھا۔ اس پر کسی کی نظر نہیں  
 پڑی اور نہ کسی کو دکھائی دیا۔“ نو واردوں میں سے ایک نے  
 ہاتھ جوڑ کر بڑے آرام سے سب کچھ بتادیا۔  
 ”تم دونوں مجھے یہ کہانیاں نہ سناؤ، مجھے اب یہ  
 پودا کسی بھی صورت میں مجھ ہوا چاہیے۔ میں اب یہ قصہ  
 تمام کر دینا چاہتا ہوں۔“ ابرار نے کرخت آواز میں کہا۔  
 ”جی سائیں.....!! جو آپ کا حکم ہوگا، وہی  
 ہوگا، جیسے ہی زین بابا.....!! کی نظر میں یہ پودا آیا، ہم  
 نے آپ کو بروقت اطلاع کر دی، اور اس کی پہنچ سے  
 زین بابا کو بہت دور کر دیا۔“  
 ”ہاں.....!! یہی تو تمہاری ڈیوٹی تھی۔ اس کام  
 پر میں نے ہی تم دونوں کو لمبے عرصے سے رکھا تھا۔ پہلی  
 بار تم دونوں نے بہت اچھا کام کیا، میں اس کام کا تم  
 دونوں کو منہ مانگا انعام دوں گا۔ بس بہت خرچہ  
 ہو گیا۔ اس معاملے پر اب اس کو اختتام پذیر ہونا چاہیے  
 اور اس لڑکی کو کبھی مر جانا چاہیے۔ جیتے جیتی، وہ کبھی بھی  
 ہمارے دلا میں قدم نہیں رکھ سکے گی۔“ ابرار نے نہایت  
 کردار سے کہا۔ زین کو اب سب کچھ سمجھ میں آ گیا تھا۔  
 اس کو وہ دیوار مل گئی تھی۔ جو اس کے اور سوہا کے درمیان

حائل ہوگئی تھی۔ وہ اس انکشاف پر اپنی جگہ جم سا گیا تھا۔ کیونکہ اس کا باپ اور وہ دو گرگے، اس کی زندگی کی خاتمے کی بات کر رہے تھے۔

مگر ڈیڈ.....!! اب سوہا کا خاتمہ کیوں چاہتے ہیں، وہ تو یہ سب بہت پہلے بھی کر سکتے تھے۔ شاید قدرت کو اس کی زندگی منظور تھی۔ اس لیے وہ ایسا کچھ بھی نہیں کر سکے اور اللہ نے مجھے ایک موقع دے دیا ہے۔“

زین کے آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔  
”تم دونوں اس گلاب کے پودے کو میری کار کی ڈکی میں رکھ دو، ہم اسے سمندر برد کر رہے ہیں۔“  
ابرار نے کہا اور گاڑی کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ ان دونوں نے جلتے گلاب کے گملے کو پکڑا اور اس کے پیچھے لے جانا شروع کر دیا۔ اچانک ابرار رک گیا۔ اس نے مڑ کر ان دونوں کو دیکھا۔

”میں نے تم دونوں کو یہ پودا زمین کے اندر دفن کرنے کو کہا تھا۔ مگر تم دونوں نے اس کو عام پودے کی طرح بودیا۔ تم دونوں کسی کام کے نہیں ہو، نکلے، بالکل ہڈ حرام نکلے ہو۔“ وہ غصے سے چلایا۔

”سائیں.....!!! ہمیں بڑے سرکار نے ایسا کرنے سے منع کر دیا تھا اُس کا کہنا تھا، اگر پودا زمین میں دفن کر دیا تو یہ مر جھا جائے گا۔ اس سے وہ قید سایہ نکل کر دوبارہ لڑکی کے جسم میں داخل ہو جائے گا۔ وہ ٹھیک ہو جائے گی۔ بڑے سرکار نے ہمیں ایسا کرنے کو کہا تھا، یہ پودا کسی کو بھی نظر نہیں آ سکتا تھا، اور اس کو کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ مگر سوائے زین بابا کے، کیونکہ وہ اس سے محبت کرتا تھا اور جو محبت کرتے ہیں۔ وہ کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی مقام پر مل جاتے ہیں، اس لیے زین بابا کا اس پودے سے ٹکراؤ ہو گیا۔“

”بس کر دو، اب میں اور کچھ نہ سنوں.....!! تم دونوں یہ پودا میری کار کی ڈکی میں ڈال دو۔“ ابرار اب آگے جا رہے تھے، وہ دونوں اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے تھے، دونوں نے دائیں، بائیں اطراف سے گملا پکڑ رکھا تھا۔ وہ پودا اتنا بھاری نہیں تھا، مگر فطری ڈر کی وجہ

سے وہ ڈر رہے تھے۔ ابرار اب سڑک پر کھڑے کار کی ڈکی کھول رہے تھے۔ دونوں بہت دھیرے چل رہے تھے۔ زین بھی آہستہ قدموں سے ان کے پیچھے چلنے لگا تھا۔ اب وہ لوگ پودا ڈکی میں رکھ چکے تھے۔ ابرار گاڑی میں بیٹھ گئے۔ وہ دونوں پیچھے بیٹھنے لگے۔ زین کا دماغ سائیں، سائیں کرنے لگ گیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔ اس نے بنا سوچے سمجھے اپنی گاڑی کی طرف ڈورنا شروع کر دیا۔ وہ ان لوگوں کو روکنا چاہتا تھا۔ اس سے وہ پودا چھیننا چاہتا تھا۔ وہ انہیں سمندر میں کیسے پھینک سکتے تھے۔ محبت تو اس نے بھی سوہا سے کی تھی۔ تو اکیلے سوہا کو کیوں سزا مل رہی تھی۔ ان کی گاڑی اب اسٹارٹ ہوگئی تھی۔ زین بھی اپنی گاڑی کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ اب وہ ان کے پیچھے جا رہا تھا۔ اس نے کار کے ڈیش بورڈ میں ہاتھ ڈال کر دیکھا، وہاں اس کا پستول پڑا ہوا تھا، اس نے پستول نکال کر پینٹ کی بلٹ میں اُڑس دیا۔ اس کا چہرہ خوف سے سیاہ پڑ گیا تھا۔ وہ بہت ڈر رہا تھا۔ وہ سوہا کو بچانے کے لیے کچھ بھی کرنا چاہ رہا تھا۔ مگر وہ کانپ رہا تھا۔ اس کا وجود کپکپاہٹ کا شکار تھا۔ اسے کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ اسے ان سب کی امید نہیں تھی، جو ہونے جا رہا تھا۔ جو ہو رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

ایک سال پہلے۔

سوہا یونی کے گراؤنڈ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کا اتنی آسانی سے ایڈمیشن ہو جائے گا۔ اس یونی میں ایڈمیشن ملنا خواب کو جیسے تعبیر ملنے کی بات تھی۔ اس کے پاس اخراجات کے لیے بالکل بھی پیسے نہیں تھے۔ مگر یونی والے قابل لوگوں کو اس کا لرزش پ دے رہے تھے۔ اس نے بھی اپنے تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ ایک اپلیکیشن لکھی اور اس کا لرزش پ کے لیے اپلائی کر دیا۔ چند دن بعد اسے بلا یا تھا۔ وہ بے انتہا خوش تھی۔ اس سے پہلے وہ اتنی خوش نہیں تھی، اس نے جبرئیلز م کرنا تھا۔ سوہا نے ہمیشہ اسے پلس گریڈ لیا تھا

اس جیسے طلباء کو ادارے کی اشد ضرورت ہوتی ہے، کیونکہ وہ ادارے کے ساتھ ساتھ ملک کا نام بھی روشن کرتے ہیں۔ سوہا دلجمعی کے ساتھ اپنی پڑھائی میں مصروف ہو گئی، اسے اپنے گھریلو حالات کا خوب علم تھا، وہ اپنے گھریلو حالات کو تبدیل کرنا چاہتی تھی۔ اس کا ایک چھوٹا سا گھر تھا، جو شہر کے دوسرے کنارے واقع تھا، گھرا پنا تھا، مگر بے حد چھوٹا تھا۔ اس چھوٹے سے گھر میں چھ افراد بڑی محبت سے رہتے تھے، ایک اس کا باپ، باقی اس سے چار چھوٹے بہن، بھائی، وہ سب اس سے چھوٹے تھے، اس کی ماں کا انتقال ہو چکا تھا۔ اب وہی اس گھر کی بڑی تھی۔ وہی ماں کی جگہ تھی۔ سب ذمہ داریاں اسی نے سنبھالی ہوئی تھیں۔ سب سے پہلے سوہا تھی، پھر اس کی بہن روہا تھی، پھر دونوں چھوٹے بھڑواں بھائی آشان اور کاشان تھے۔ اس سے آخر میں سب سے چھوٹی زوہا تھی۔ زوہا جب چھ ماہ کی تھی، زینت بیگم کرنٹ لگنے سے انتقال کر گئی۔ کپڑے دھونے والی مشین میں کرنٹ تھا، اور وہی اس کی موت کا سبب بنا، تب سوہا میٹرک کر رہی تھی۔ ماں کے بے وقت انتقال نے اسے وقت سے جیسے پہلے بڑا کر دیا، وہ تعلیم گھر کے لیے چھوڑنا چاہ رہی تھی۔ مگر اس کی ماں کی آخری خواہش تھی۔ اس کے سب سے بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کر لیں اور اس کے باپ شاہ زر کی بھی یہی کوشش تھی کہ بچوں کی وجہ سے سوہا کی تعلیم نہ چھوٹ جائے۔ اس نے اسکول سے چٹھیاں لے لیں۔ سوہا نے محلے کے سارے بچوں کو ٹیوشن پڑھانا شروع کر دیا۔ وہ تعلیم کے ساتھ چھوٹے بہن بھائیوں کا خصوصی خیال رکھنے لگی۔ شاہ زرا انتہائی غریب تھے۔ بس دو وقت کا گزارہ ہو رہا تھا۔ اس لیے کہ سفید پوشی کا بھرم تھا۔ اور کچھ نہیں تھا۔ وہ سب اس میں خوش تھے۔ اللہ نے رزق دینے کا وعدہ تو کیا ہے، مگر خواہشات پوری کرنے کے لیے سخت محنت کرنا پڑتی ہے۔

سوہا اب جرنلزم ڈیپارٹمنٹ میں تھی۔ جبکہ روہا میٹرک کر رہی تھی۔ وہ اپنا ماسٹر کمپیٹ کرنے کے بعد الیکٹرانک میڈیا میں جانا چاہ رہی تھی۔ اس کا باپ شاہ زر

معمولی ساسر کاری فارم ہاؤس میں ملازم تھا، وہ دو بچے تک گھرا جاتا تھا۔ اس نے زوہا کی پرورش ماں باپ بن کر کی تھی۔ وہ شام کو ایک دوسری جگہ بھی پرائیویٹ کام کرتے تھے۔ اور پھر رات دس بجے تک گھرا جاتے تھے۔ وہ اپنے گھر کے اخراجات پرائیویٹ سیلری سے پورے کر رہے تھے۔ وہ اپنی گورنمنٹ سیلری بینک اکاؤنٹ میں محفوظ کر رہے تھے۔ کیونکہ اس کو یہ تھا کہ اس کی تین بیٹیاں بھی ہیں، جو عنقریب جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ رہی ہیں۔ زندگی بس گزر رہی تھی۔ جیسے دوسرے لوگوں کی گزرتی ہے۔

سوہا کا خواب تھا، اسی یونی میں پڑھنے کا، وہ خواب اب پورا ہو گیا تھا۔ جرنلزم ڈیپارٹمنٹ میں امیر لڑکیوں کی بہتات تھیں، مگر سوہا نے بھی خود کو ان سے کمپیئر نہیں کیا۔ کیونکہ اگر آپ دوسروں سے خود کو کمپیئر کر دے تو آپ میں احساس کمتری جنم لے لے گی۔ اور تو کچھ بھی نہیں ہوگا۔ مگر احساس کمتری ڈپریشن کا مرض بن جاتی ہے۔ اور ڈپریشن بہت خطرناک ہوتا ہے۔ وہ لڑکیاں سوہا کو اتنا پسند بھی نہیں کرتی تھیں، کیونکہ وہ لڑکیاں، روز پورا بیوٹی پارلر لٹا کر آ جاتی تھیں، پھر بھی سوہا کے سادہ حسن کا مقابلہ نہ کر پاتیں، سوہا نے اپنی قابلیت سے بھی پروفیسرز کے دل میں خاص جگہ بنالی تھی۔ وہ ٹیلنٹ سے بھرپور تھی اور جہاں کسی میں ٹیلنٹ ہوتا ہے، وہاں دوسرے بلا وجہ کیوں جل بھن کر کباب بن جاتے ہیں۔ ایسا معاملہ دوسری امیر کمبری، ڈیڈیز لڑکیوں کا بھی تھا، وہ لڑکیاں ہتھیاروں سے لیس ہو کر لڑکوں کے پیچھے پھرا کرتی، مگر وہ سارے لڑکے سوہا سے متاثر نظر آتے تھے۔ یہاں بھی وہ سوہا سے مات کھا جاتی تھی۔ اس لیے ان لڑکیوں کی اس سے کبھی نہ بن سکی۔ سوہا کو کبھی کچھ شوق نہ تھا، کہ وہ ان جیسی خود مہر لڑکیوں سے دوستی کرے، اور ان کی منت سماجت کرے۔ وہ لڑکوں کو بھی اپنے قریب نہیں آنے دیتی تھی اور نہ کسی سے اپنا فیملی بیک گراؤنڈ کبھی ڈسکس کیا تھا۔ لڑکے، لڑکیاں روزنی پارٹیاں کرتے تھے۔ مگر بھی سوہا ان

”ارے.....!! تم نہا کا کڑ کو نہیں جانتی، اس دور کی سب سے زیادہ ہٹ سنگر ہے۔ اس کی کانوں کی پاکستانی قوم دیوانی بنی ہوئی ہے“۔ زین نے اسے بتانا شروع کر دیا۔

”بچی.....!! میں کسی نہا کو نہیں جانتی، میں آج کل گانے سنتی ہی نہیں ہوں۔ سچ بتاؤں، میں بالکل بھی کسی سنگر کو نہیں جانتی“۔ اس نے مزے سے بتایا۔

”کیا؟ تم مذاق کر رہی ہو؟ زین کو حیرت ہوئی۔“  
”میں کیوں مذاق کروں گی۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔ ویسے آپ کی کچھ زیادہ ہی فیوریٹ سنگر ہے۔ اس لیے آپ کو برا لگ رہا ہے۔“ سوہانے آخر میں شرارت سے کہا۔

”نہیں، میری فیوریٹ تو نہیں ہے، مگر جہاں بھی جاؤں، اسی سنگر کے گانے بجنے لگتے ہیں۔ کیا تم نے یہ گانا سنا ہے۔“

”لے ہو تم ہم کو بڑے نصیبوں سے“  
”چرا یہ ہے تم کو قسمت کی لکیروں سے؟“ زین نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

”نہیں.....!! بالکل بھی نہیں سنا، میں سنوں گی۔ تمہارا من پسند گانا ہے۔“ سوہانے کتابیں سمیٹنا شروع کر دیں۔

”اچھا، ابھی سن لو، تو میں ابھی موبائل سے پلے کر دیتا ہوں۔“ زین نے جیب سے موبائل نکالا، اور نہا کا کڑ کا گایا ہوا گانا پلے کر دیا: ”لے ہو تم ہم کو بڑے نصیبوں سے۔ چرا یہ ہے تم کو قسمت کی لکیروں سے؟“ سوہا بہت غور سے سن رہی تھی۔ گانا سننے کے بعد سوہانے کہا: ”واؤ اٹس ونڈر فل.....!! بہت اچھا گانا ہے۔ واقعی سنگر نے جادو سا کر دیا ہے۔“ سوہانے دل سے تعریف کی۔

”سوہا تمہارا ڈمپل، فلم اسٹار پریٹی زنا سے زیادہ گہرا اور خوبصورت ہے۔ تمہارے گال اس سے مزید خوبصورت لگتے ہیں۔“ سوہا اس کو حیرت سے دیکھنے لگی، کیونکہ وہ اس کی تعریف سُر رہا تھا۔ مگر سچ میں یہ فلم اسٹار کی بات لا رہا تھا۔ تو اسے عجیب لگ رہا تھا۔

میں نہیں گئی۔ وہ اس چیز سے دور رہتی تھی۔ مگر پھر ایک دن وہ زین سے ملی، زین کی شخصیت نے اس پر گہرا اثر چھوڑا تھا۔ وہ اس سے مل کر خوش ہوئی تھی۔ اس کو لگا کہ اس کے دل نے کوئی دھڑکن ہی مٹ کر دی ہے۔ اس نے خود سے عہد کر رکھا تھا کہ کبھی محبت میں نہیں پڑے گی۔ اور نہ محبت میں اپنا وقت ضائع کرے گی۔ مگر زین کے معاملے میں وہ بے بس ہو گئی، اس نے اپنا عہد توڑ دیا۔ وہ اس سے ملنے لگی۔ اس کی دوست بن گئی۔ وہ بھی اس سے پہلی نظر والی محبت کرنے لگ گئی تھی۔ زین کو اس کا گانا اس کی لکھی شاعری اتنی پسند آ گئی تھی، کہ وہ جب بھی اس سے ملتا وہ اسی کے بارے میں بات کرتا، سوہا ہمیشہ اس کے منہ سے منتظر رہتی کہ کب وہ اپنی دل کی بات بتائے گا، مگر زین نے ہمیشہ اس کو ایک اچھے دوست کی طرح ٹریٹ کیا، مگر جو کچھ سوہا اس کی آنکھوں میں دیکھتی تھی، وہ پیارا کا پیغام اس کو ابھمن میں ڈال دیتا تھا، وہ کبھی نہیں سمجھ سکی، کہ زین اصل میں چاہتا کیا ہے۔ وہ خود کو لاکھ بہلا دے دیتی، مگر کبھی بھی زین کے منہ سے ایسا کچھ نہ سن پائی۔ وہ ایک خوبصورت سادہ تھا، جب وہ اور زین یونی گراؤنڈ میں بیٹھے ہوئے تھے اور زین اس کی آواز کی تعریف کر رہا تھا۔

”سوہا.....!! تم نے اتنا اچھا گانا کس سے سیکھا ہے؟“ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں محبت کا پیغام نظر آ رہا تھا۔

”زین.....!! یہ گاؤ گفٹ ہے، میں اپنے رب کی شکر گزار ہوں، کہ لوگ کتنی محنت کرتے ہیں۔ مگر مجھ میں یہ ٹیلنٹ موجود ہے۔ یہ قدرتی صلاحیت ہے۔“ وہ آخر میں ہلکے لکڑی کر بنس پڑی۔

پھر بھی آپ نے اتنی اچھی گائیگی کی ہے کہ جتنی ملک کی نہا کا کڑ تو آپ کے سامنے چنے بچتی ہوئی نظر آئے۔“ زین نے ایک ابرو اٹھا کر مزے سے کہا۔

”کیا؟ کون؟ آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟ میں کسی نہا کو نہیں جانتی۔ اور نہ اس کا کوئی گانا سنا ہے۔“ سوہانے زین کی طرف دیکھا۔

”زین میں اس کو بھی نہیں جانتی، پتہ نہیں یہ کون ہے، تم کیوں مجھے انگریزوں سے ملارہے ہو“۔ سوہانے ساری کتابیں سمیٹ دی تھیں۔

”کیا تم اس کو بھی نہیں جانتی، یہ انگریز نہیں ہے، انڈیا کی بہت بڑی فلم اُستار ہے، اس کے گال میں بھی ڈمپل پڑتا ہے۔ اور یہ ڈمپل گرل سے مشہور تھی، اس کو یونانی قدیم حسین عورت کا خطاب ملا تھا“۔ زین نے جیسے اس کی معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے کہا۔

”زین....!! میں انڈیا جیسے دوغلے ملک کی فلمیں، اور گانے نہیں دیکھتی، اور اہم بات یہ ہے کہ ابھی میں پڑھ رہی ہوں۔ ان سب خرافات کے لیے میرے پاس کوئی نام نہیں ہے۔ وہ گانا جو میں نے پارٹی میں گایا تھا۔ میم کی وجہ سے گایا تھا۔ اس نے مجھے گنگنائے ہوئے سن لیا تھا۔ اس لیے ان کو میں ناراض نہیں کر سکتی تھی۔“ سوہانے اس کو دیکھا۔ اب وہ سنجیدہ سی تھی۔ اس کے چہرے کا ڈمپل غائب تھا۔ زین اس سے ہمیشہ متاثر ہوا تھا۔ وہ جب بھی اس سے ملا تھا۔ اس نے اپنی بات چیت سے اس کو اپنا گرویدہ کر لیا تھا۔ زین کے اصرار پر ہی وہ دونوں اب کینیٹین چارہ تھے۔ اب وہ ایک دوسرے کے بالکل آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ کینیٹین میں سوہا کو وہ لڑکے بڑے غور سے دیکھ رہے تھے، جو اس سے فرینڈ شپ کے خواہش مند تھے، اور زین کو وہ لڑکیاں کھا جانے والی نظروں سے گھور رہی تھیں، جو اس پر مرتی تھیں۔ مگر زین اور سوہا ان سب سے بے پرواہ اپنے بیچ میں بڑی تھے۔

☆.....☆.....☆

ہر گزرتے دن کے ساتھ وہ دونوں پہلے سے بھی قریب آئے تھے۔ زین نے اپنی ہر بات اس سے شیر کر دی تھی، مگر سوہا تو جیسے کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ اس لیے اس نے کبھی بھی زین سے کوئی گھریلو مسئلہ شیر نہیں کیا۔ دونوں نے اگر کوئی بات ایک دوسرے سے نہیں کی تھی، تو وہ صرف اظہارِ محبت تھا۔ وہ دونوں ابھی اسٹوڈنٹس تھے، پڑھ رہے تھے۔ اس لیے ابھی انتظار کر

رہے تھے۔ زین پہلے اسٹڈی کمپلیٹ کرنا چاہتا تھا، پھر سوہا کو اپنانا چاہتا تھا۔ مگر دونوں کو دل ہی دل میں پتہ تھا کہ وہ ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں۔ سوہا کو پتہ چل چکا تھا کہ زین اس سے شدید محبت کرتا ہے، مگر وہ جان کر بھی انجان بنی رہی، اس نے بھی سب کچھ جیسے وقت کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔ زین محبت کرنے کے باوجود یہ جان پایا تھا کہ سوہا جان چکی ہے کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں اور اسی کو اپناؤں گا، مگر زین نے کچھ تردید نہیں کی۔ زین سوہا کو روز بس اسٹاپ سے ایک اینڈ ڈراپ کرتا، کئی بار زین نے کوشش کی، کہ وہ اسے گھر چھوڑیں۔ مگر سوہا نے کبھی اس کو یہ موقع نہیں دیا۔ وہ اسی میں خوش تھی۔ زین کو اس کے غربت پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ جہاں پیار ہوتا ہے، وہاں نو اسٹینٹس کا فرق کچھ معنی نہیں رکھتا۔ اور جہاں یہ چیز دیکھی جاتی ہے۔ وہاں پیار نہیں صرف، غرض، لالچ، دھوکہ اور مطلب ہوتا ہے۔ دو پیار کرنے والے کبھی امیری غریبی کے فرق کو نہیں مانتے، مگر ان کے آگے پیچھے جو لوگ ہوتے ہیں۔ وہ بہت اہم ہوتے ہیں۔ وہ اس فرق کو کبھی تسلیم نہیں کرتے۔ وہ لوگ سب سے زیادہ ان کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ جو ان کی محبت کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔ اور ان کی انا اس محبت کو کھا جاتی ہے۔ زین پہلے سے زیادہ خوش باش رہنے لگا، اسے ہر چیز سے محبت ہو گئی۔ پہلے لا پرواہ سا تھا، اب تو یکسر بدل گیا۔ وہ گھر سے اکثر غیر حاضر رہنے لگا۔ جب کبھی گھر میں ہوتا تو سوہا کے خیالوں میں گم صم رہتا۔ پارٹیز میں اس نے آنا جانا چھوڑ دیا۔ وہ دنیا کو بھلا بیٹھا تھا۔ وہ بے وجہ خوش، ہنسنے مسکرانے لگتا، کیونکہ کائنات کا سب سے خوبصورت جذبہ اس پر آشکار ہوا تھا۔ محبت جہاں کہیں بھی اپنا بیج بونی ہے۔ وہاں وہ بیج بہت جلد کو نیل بن ہی جاتا ہے۔ اور پھر بھنی بھنی خوشبو ہواؤں میں بکھیر جاتا ہے۔ زین کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ اس کی محبت کی خوشبو دوسروں تک پہنچ گئی تھی۔

وہ بہت جلد ابرار کی نظروں میں آ گیا تھا۔

”زین.....!! بیٹا تو ایسا نہ تھا، کیا وجہ ہے اس کی زندگی یکسر بدل گئی ہے، کیا زین کو کسی سے محبت ہو گئی ہے۔ مجھے اس کی تبدیلی کے پیچھے محبت کا جذبہ ہی نظر آتا ہے۔ میں نے زین کو کتنا منہ کیا تھا کہ سب کچھ کرنا، مگر محبت نہیں کرنا۔ کیا زین میرا حکم بھول گیا، کیا زین کو یونیورسٹی میں کسی سے محبت ہو گئی، کیوں کیا وہ کسی زلفوں کا اسیر بن گیا، کیا وہ میری ہر نصیحت بھلا بیٹھا، میں نے اسے منع بھی کیا تھا۔ جس جگہ تم جا رہے ہو۔ وہ پڑھنے کی جگہ ہے، محبت، عشق اور دل لگانے کی جگہ نہیں ہے۔ زین میری بات کیسے بھول گیا۔“ ابراہار سوچ رہا تھا، وہ انتہائی پریشان ہو گیا تھا۔ اس کو کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کرے تو کیا کرے۔

”مجھے اب کچھ کرنا ہوگا، اس لڑکی تک پہنچنا ہوگا، جس نے زین کے دل پر قبضہ جما لیا ہے۔“ ابراہار وینٹ چیئر پر جیسے بھول رہے تھے۔ وہ اس کمرے میں بالکل تنہا تھے۔ اس کو کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ زین کے اطوار نوٹ کر چکے تھے۔ زین کے سب دوستوں کو اس سے شکایتیں ہونے لگی تھیں۔ وہ پہلے جیسا وقت اب دوستوں کو کہاں دیتا تھا۔ زین تو جیسے اپنی دنیا میں مست ہو گیا تھا۔ ابراہار جیسے آدمی کو بروقت پتہ چل گیا تھا۔ اس نے بہت غور کیا تھا۔ وہ آخر اس نتیجے پر پہنچ ہی گیا۔

زین پہلے یونی جاتا تھا، پھر ایک جگہ اکیڈمی تھی، وہاں سے پھر کلب، پھر دوست، پھر شام کے وقت سوئمنگ، اب یونی شوق سے جاتا تھا۔ بانی ساری مصروفیات جیسے ترک کر دی تھیں۔ وہ موبائل پر زیادہ بڑی رہنے لگا۔ ہر وقت قومی زبان میں بات کرتا۔ پہلے وہ زیادہ انگریزی میں بات چیت کرتا تھا۔ اب تو جیسے وہ انگلش بھول ہی چکا تھا۔ ابراہار تو اس کی طرف سے تشویش میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اہم وجہ بھی یہی تھی کہ وہ زین پر کڑی نگاہ رکھتے تھے۔ اس مہینے تو جیسے زین کی ساری زندگی ہی تبدیل ہو چکی تھی اور ابراہار کو پتہ تھا کہ تبدیلی صرف اور صرف اس کی زندگی میں محبت ہی لاسکتی ہے۔ زین کو تو کسی بھی چیز کی کمی نہیں تھی۔ ابراہار اور زین تاشہ نے

اسے بے پناہ محبت دی تھی۔ مگر اب اسے برا لگ رہا تھا کہ زین کی محبت میں بنا اجازت کے یہ کون آگئی ہے۔ جو پوری طرح سے اس پر حاوی ہو گئی ہے۔ وہ قطعاً یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ پھر ابراہار نے ایک مشکل فیصلہ کر لیا۔ اور اس لڑکی کو دیکھنا چاہا، جس نے زین کی زندگی یکسر تبدیل کر دی تھی۔ ابراہار نے زین کی زندگی پر اب نظر رکھنی شروع کر دی۔

☆.....☆.....☆

ابراہار کے آفس میں ایک آدمی کام کرتا تھا، وہ اس کا ور کرتا تھا۔ اس کا نام میران تھا۔ میران ابراہار احمد کا پہلے سے کافی احسان مند تھا۔ وہ ابراہار کے لیے جان بھی دے سکتا تھا۔ کیونکہ میران انتہائی غریب آدمی تھا اور ابراہار نے اس کی کئی بار مالی امداد کی تھی۔ یہ مالی مدد ابراہار نے اس کی اس لیے کی تھی کہ بدلے میں اس کو اپنے کام لایا جاسکے۔ میران نے ابراہار احمد سے درخواست کی تھی، اس کا ایک لائق بیٹا تھا۔ جو گریجویٹ تھا۔ وہ آگے پڑھنا چاہتا تھا۔ مگر میران اسے پڑھانے نہیں سکتا تھا۔ اس کے گھریلو اخراجات اسے پڑھانے کی اجازت نہیں دے سکتے تھے۔ اس نے ابراہار احمد سے نہایت عاجزانہ درخواست کی تھی کہ اس کے بیٹے کا یونیورسٹی کا خرچہ برداشت کر لیں، اگر بعد میں ابراہار احمد چاہے تو اس کی تنخواہ سے کچھ ہر ماہ کاٹ بھی سکتا ہے تو میران کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ ابراہار احمد نے رحم دلی دکھا کر اس کے بیٹے کی یونیورسٹی کے سارے ڈیوڑ کلیمز کر دئیے۔ اور اس سے دوبارہ پیسے بھی نہیں مانگے۔ ابھی وہی لڑکا زین کی یونی میں پڑھ رہا تھا۔ اس لڑکے کا نام راحم تھا۔ راحم ابراہار کا بے حد مشکور تھا۔ وہ فائن آرٹس کا اسٹوڈنٹ تھا۔ ابراہار نے اس کے باپ میران سے کہہ کر راحم کو کل اپنے آفس میں بلوایا تھا۔ آج وہ ابراہار کے آفس میں موجود تھا۔ وہ لڑکا تذبذب کا شکار تھا۔ اس کو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ابراہار اس سے چاہتا کیا ہے؟ ابھی تو چند مہینے پہلے اس کی تعلیم شروع ہو گئی تھی۔ وہ گھبراہٹ کے مارے بیچ طرح سے سلام تک بھی نہ کر سکا تھا۔ اکثر غربت انسان



سے اس کا اعتماد بھی چھین لیتی ہے۔ ابرار اس کو سر سے پیر تک گھورے جا رہا تھا۔

”راحم.....!! نام ہے نہ تمہارا؟“ ابرار نے دونوں آنکھیں اس پر مرکوز کر دیں۔

”ہاں.....!!“ ابرار نے اثبات میں سر ہلایا۔

”تمہیں میرا ایک کام کرنا ہے، بولو کیا کر پاؤ گے۔“ ابرار نے معنی خیزی سے کہا۔

”ہاں.....!!“ آپ حکم کریں، میں آپ کے لیے جان بھی دے دوں گا۔“ اس نے ابرار کی طرف دیکھا۔

”دیکھو لڑکے، تم میں ذرا سا بھی اعتماد ہو، تو تم کام بھی کر سکو گے۔ ابھی تم اور اسمارٹ بننے کی کوشش

کر رہے ہو۔ میں جو کام تم سے کروا رہا ہوں۔ وہ بالکل بھی مشکل نہیں ہے۔“ ابرار نے اس کی طرف دیکھا۔

”سر.....!!“ آپ کام بتائیں میں کر لوں گا۔ آپ جو حکم کریں گے، وہ پورا ہوگا۔ میں پوری ایمانداری سے

آپ کا کام کروں گا۔“ راحم نے اپنا اعتماد بجالا کر لیا تھا۔

”اس کو جانتے ہو؟“ ابرار نے راحم کی طرف زین کی تصویر بڑھائی۔

”نہیں“.....!! راحم نے کافی دیر غور سے تصویر کو دیکھا۔

یہ میرا بیٹا ہے۔ اس کا نام زین ہے۔ تم جس یونی میں پڑھ رہے ہو۔ اسی میں یہ بھی پڑھتا ہے۔ یہ

بزنس پڑھ رہا ہے۔ مگر میں اس کی طرف سے مطمئن نہیں ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس پر نظر رکھنا شروع کر دو۔

اس کی ایک ایک منٹ کی خبر مجھے پہنچاؤ۔ تم اس کے اوپر نظر رکھو گے، اس کو فلو کرو گے کہ یہ کیا کرتا ہے، کہاں

جاتا ہے؟ کس کس سے ملتا ہے؟ کیا تم یہ کام کر سکو گے؟“ ابرار نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ لڑکا راحم کچھ

گھبرا رہا تھا۔ اس نے کچھ دیر سوچا پھر جواب دیا۔

”سر.....!!“ کام تو میں کر سکوں گا، مگر ایک مسئلہ ہے۔

”کون سا مسئلہ؟“ ابرار نے اپنی آواز قصداً بھاری کر دی۔

”سر.....!! زین صاحب تو آپ کا بیٹا ہے، وہ تو گاڑی میں آتا جاتا ہے۔ میں پیدل آتا ہوں۔ یونی کے

اندر تو پھر بھی میں اس پر نظر رکھ سکوں گا۔ مگر جب وہ گاڑی نکال کر لے جائے گا، پھر میں اس کے پیچھے نہیں

جاسکوں گا۔“ راحم نے اپنی الجھن بتائی۔

”ہوں.....!! بات تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو، کیا تم موٹر سائیکل چلا سکتے ہو؟“ ابرار نے معنی خیزی سے

اس کی طرف دیکھا۔ اب وہ آنکھیں چھوٹی کر رہا تھا۔

”جی بالکل میں موٹر سائیکل چلا سکتا ہوں، پر میرے پاس نہیں ہے۔“ راحم نے ہچکچا کر کہا۔

”کوئی بات نہیں، میں تمہیں اچھی کمپنی کا بائیک دلا دوں گا، اور میں تمہارے لیے ایک اچھا سا سمارٹ

فون بھی خرید کر دے دوں گا۔ تم نے رازداری سے زین کی تصویریں اور ویڈیوز بنائی ہوں گی۔ کیا تم یہ کام کر سکو

گے۔“ اس نے راحم کو دیکھا۔

”ہاں سر کر لوں گا۔“ راحم نے اثبات میں سر ہلایا۔

”ٹھیک ہے، مگر کسی کو بھی اس بارے میں پتہ نہیں چلنا چاہیے، کیونکہ یہ معاملہ ہمارے درمیان ہوگا۔

ورنہ پھر تمہارے لیے بالکل بھی اچھا نہیں ہوگا۔ میں تم پر اعتماد کر رہا ہوں، تو اس کا یہ ہی مطلب ہے کہ تم مجھے کام

کے لگ رہے ہو۔ ورنہ یہ کام میں کسی پروفیشنل سے بھی کروا سکتا ہوں۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ میں نے

سوچا کہ تم غریب ہو۔ اگر تم کر پاؤ گے۔ تمہارا بھلا ہو جائے گا۔ موبائل اور بائیک تمہاری ہو جائے گی۔ اس

کے علاوہ میں تمہیں معاوضہ بھی دوں گا۔ اب بولو کیا تیار ہو؟“ پہلی بار ابرار نے اس کے ساتھ تفصیلی بات کی۔

”جی سر میں تیار ہوں۔“ راحم نے خوشی سے کہا۔

”اوکے ٹھیک ہے۔ میں تمہارے ساتھ اپنے سیکریٹری کو بھیج رہا ہوں، وہ تمہارے لیے نیا موبائل اور

نیو ماڈل ہنڈا بائیک خرید کر دلوادے گا۔“ ابرار نے نظریں اس کے چہرے پر گاڑ کر کہا۔ راحم نے سر اثبات میں ہلایا۔ اب راحم اس کے سیکریٹری کے ساتھ بہت

بڑی سی گاڑی میں جا رہا تھا۔ وہ دونوں پہلے بازار گئے۔

فوکس کر دیا۔ اب گاڑی پارکنگ میں کھڑی ہو گئی، وہ دونوں کی موبائل سے شارٹ ویڈیو کلپ بنا رہا تھا۔ وہ دونوں اب کسی بات پر ہنس رہے تھے۔ وہ اس ڈائریکشن میں کھڑا تھا کہ کسی کو اس پر شک بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ سوہانے خوبصورت سفید لباس کا فراک پہنا ہوا تھا۔ وہ اس میں پری لگ رہی تھی۔ زین بھی بے حد وجہ تھا، دونوں کی جوڑی غضب ڈھا رہی تھی۔ جب وہ دونوں پارکنگ سے نکل گئے۔ تو راحم بھی ان دونوں کے پیچھے چلنے لگا۔ وہ مناسب فاصلے سے ان کا پیچھا کر رہا تھا۔ وہ دونوں کلاسز کے بجائے کینٹین کی طرف چلے گئے۔ راحم بھی ان کے قریب ایک ٹیبل پر بیٹھ گیا۔ وہ اب ان کی تصویریں بنا رہا تھا۔ اس کے پاس دونوں کی اچھی خاصی ویڈیو بن چکی تھیں۔ جس میں گاڑی سے لے کر پارکنگ آنے کی فوج تھی۔ ان دونوں کو ذرا بھی شک نہیں گزرا کہ کوئی تیسرا ان کی حرکات کو قید کر رہا ہے۔ وہ دونوں اب اپنے اپنے ڈیپارٹمنٹ چلے گئے۔ راحم اپنی جگہ بیٹھا اب وہ کچھ نہیں کر رہا تھا۔

اگلے دن راحم نے سوہا کی فوج بنوائی تھی، وہ دونوں پر برابر نظر رکھنا چاہتا تھا۔ سوہا آج بھی زین کے ساتھ آئی تھی، آج وہ دونوں وائیٹ ٹکڑی کار میں آئے تھے۔ راحم نے آسانی سے یہ مرحلہ بھی سر کر لیا تھا۔ جیسے ہی وہ دونوں الگ ہوئے، راحم نے سوہا پر نظر رکھنی شروع کر دی۔ وہ کافی فاصلے سے اس کے پیچھے پھر رہا تھا۔ سوہا زین کے علاوہ کسی سے بھی نہیں ملی۔ اس نے سوہا کی دن بھر کی ساری معمولات اچھی طرح سمجھ لی تھی۔ اس کے بعد چھٹی کے بعد اس نے زین اور سوہا کا پیچھا بھی کیا۔ جب سوہا اس کی گاڑی سے اتری، تو اس نے اس وین گن کا بھی پیچھا کیا۔ اور وہ سوہا کے گھر تک پہنچ گیا۔ اس کا گھر اچھا خاصا دور تھا۔ وہ کئی دنوں تک سوہا کی معمولات پر نظر رکھتا رہا، اس کو سوہا بھی کسی دوسرے لڑکے سے ملتی دکھائی نہیں دی۔ راحم سمجھ گیا کہ زین اور سوہا ایک دوسرے میں انوالڈ ہے۔ اس کا موبائل ان دونوں کی تصویروں اور ویڈیوز سے بھر چکا تھا۔ راحم اب

وہاں اس کے لیے بہت خوبصورت سا پیارا اچھی کوالٹی والا موبائل فون خریدا، اس کا کیمرہ کافی دور تک زوم کیا جاسکتا تھا۔ پھر وہ باینک خریدنے چلے گئے۔ اب راحم ایک بہت خوبصورت باینک کا مالک بن گیا تھا۔ وہ تو ابرار کے آفس بہت پریشان حال گیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں کافی ڈر رہا تھا کہ کہیں ابرار احمد اس سے وہ پیسے واپس تو نہیں مانگ رہا ہے، جو اس نے اس کو اس کی تعلیم کے لیے دیے تھے۔ مگر اب وہ باینک پر خوش باش سا گھر کی طرف جا رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

راحم نے زین کا بلاک ڈھونڈ لیا۔ وہ اب زین کے پیچھے آنے جانے لگا، وہ پہلی بار اس کی جاسوسی کر رہا تھا، اس کو لگا کہ وہ نہیں کر سکے گا۔ وہ بہت گھبرایا ہوا تھا، مگر پھر اس نے جاسوسی ناول پڑھنے شروع کر دیے، کچھ انگلش جاسوسی موزین بھی دیکھ لیں۔ اس سے اس میں اچھی خاصی خود اعتمادی پیدا ہو گئی، جاسوسی فلمیں دیکھنے سے اس کی حس بھی تیز ہو گئی۔ وہ وقت سے پہلے یونیورسٹی پہنچ جاتا اور پارکنگ میں بیٹھ جاتا، وہ اخبار خریدتا اور زین کی گاڑی کا انتظار کرتا اخبار وقت گزاری کے لیے پڑھتا تھا۔ ابرار نے خود اس کو زین کی اچھی خاصی معلومات فراہم کر دی تھی۔ وہ زین کے بارے میں اچھا خاصا جان چکا تھا۔ اس کو زین کی کار کی معلومات بھی مل چکی تھی۔ اچانک زین کی خوبصورت گاڑی یونی کے گیٹ سے اتر ہوئی۔ راحم نے اخبار کی اوٹ میں کار کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ راحم نے ونڈ اسکرین کی طرف دیکھا۔ راحم نے کیپ پہن رکھا تھا، آنکھوں پر ریبن کے کلاسز لگائے تھے۔ اس نے بڑا کالا بیگ اپنے قریب رکھا ہوا تھا۔ وہ آسانی سے پہچانا نہیں جا رہا تھا۔ اس نے اپنا موبائل نکالا اور زین کی گاڑی کی طرف کر دیا۔ وہ اس طرح دکھا رہا تھا، جیسے وہ موبائل پر کچھ سرچ کر رہا ہو۔ یا کوئی گیم آن لائن کھیل رہا ہو۔ زین کے ساتھ گاڑی کے فرنٹ سیٹ پر سوہا بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے موبائل کا کیمرہ زوم کر کے دونوں پر

فوج بنانی شروع کر دی۔ جیسے ہی گھر کے دروازے سے سوہانتر ہوئی، راحم نے ویڈیو محفوظ کر لی۔

☆.....☆.....☆

وہ سوہا کے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔ کچھ دیر کے بعد سوہا کے بھائی آشان نے دروازہ کھول لیا۔ وہ اسے دیکھ کر حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔ راحم نے اسے بتایا کہ وہ سرکاری گزٹ آفیسر ہے، اور گھروالوں کی معلومات لینا جا رہا ہے۔

آشان نے فر فر سے اپنے گھر کے افراد کی معلومات فراہم کر دی۔ اس نے وہ ساری معلومات پیڈ پر لکھی۔ وہ اب وہاں سے واپس جا رہا تھا۔ راحم نے یہ مشکل معرکہ جیسے آسانی سے سر کر لیا تھا۔ حالانکہ جاسوسی کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے، جہاں کسی سے معمولی سی بھول چوک ہوئی وہی ساری محنت ملیا میٹ ہو کر رہ جاتی ہے۔ قریب رہ کر دوسروں کے قیمتی لمحات قید کرنا جادو کرنے کے برابر ہے۔ مگر کچھ بہادر ہانڈر لوگ جاسوسی ایسے عمدہ طریقے سے کر لیتے ہیں، دوسروں کو بالکل بھی کانوں کان خبر نہیں لگتی کہ اس کا پورا بائیو ڈیٹا کسی نے حاصل کر لیا ہے۔ راحم نو وارد تھا، ناڈی تھا، مگر اس نے اپنا کام بے حد اچھے طریقے سے کر لیا تھا۔ دو ہفتوں تک اس نے زین اور سوہا کے بارے میں سب کچھ جان لیا تھا۔ اور اب وہ ابرار احمد سے ملنے جا رہا تھا۔ اس نے ابرار احمد کو کال کی، اور اس سے ملنے کی بات کی، ابرار نے اسے اپنے ساحل سمندر کے قریب بنے جنگلے میں بلوایا تھا۔ یہ جنگلہ بالکل خالی رہتا تھا۔ ابرار اور زرتاشہ کبھی بکھار یہاں تفریح کے لیے آتے تھے۔

شام کا وقت تھا، ابرار کے سامنے لان میں راحم بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے پاس وہی کالا بیگ تھا۔ اب وہ تفصیل سے ابرار احمد کو سب کچھ بتوتوں سمیت بتا رہا تھا۔ اس نے ابرار کو وہ سب دے دیا۔ اب وہی موبائل ابرار کے ہاتھوں میں تھا، جس میں سوہا اور زین کی بے شمار ویڈیوز کلپس اور فوٹوز تھے۔ ابرار اب وہی غور سے دیکھ رہے تھے۔ راحم اسے سوہا کی فیملی بیک گراؤنڈ کے بارے

میں ان پر نظر رکھ رہا تھا، کیونکہ اسے مزید ثبوت اکٹھے کرنے تھے۔ راحم نے جب سے ان دونوں پر نظر رکھنی شروع کر دی تھی، وہ اپنی ایک بھی کلاس اسٹینڈ نہیں کر سکا تھا، مگر اس کو اس کی کچھ پرواہ نہ تھی۔ کیونکہ وہ بھی ذہین تھا، اور بعد میں پڑھ سکتا تھا۔ یا پھر کسی سے بھی نوٹس مانگ کر اپنا کام نکال سکتا تھا۔ وہ سارا دن یا تو سوہا کا انتظار کرتا رہتا یا پھر زین کے انتظار میں پلکان ہوتا رہتا۔ اس کا یہی معمول بن چکا تھا۔

سوہا جیسے ہی اپنی کلاس سے فری ہو جاتی، وہ سیدھا زین کے ڈیپارٹمنٹ کے باہر پہنچ جاتی اور زین کا انتظار کرتی رہتی، راحم نے اس کے کئی انتظار کرنے والے مومنٹس بھی مہارت سے اپنے موبائل میں قید کر لیے تھے۔ راحم کے پاس ان دونوں کا اچھا خاصا مواد اکٹھا ہو چکا تھا۔ آج چھٹی کے بعد زین سوہا کو ریٹورنٹ لے گیا، راحم بھی ہیملٹ پہن کر ان کے پیچھے چلا آیا۔ سوہا اور زین ریٹورنٹ میں بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ راحم ان سے کافی فاصلے پر ایک سائیڈ والے ٹیبل پر بیٹھا ہوا ان پر نظر رکھ رہا تھا۔ اس نے آج سوہا کے گھر تک پیچھا کرنا تھا۔ اور اس کے گھروالوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنی تھی۔ اسے شروع میں یہ سب کرتے ہوئے کافی ڈر لگا تھا۔ مگر اب اسے اس سب میں بہت مزہ آرہا تھا۔ کافی دور بیٹھنے کے باوجود راحم اپنے موبائل کے کیمرے کو زوم کر کے ان کی فوج بنوارہا تھا۔ جب وہ دونوں ریٹورنٹ سے نکلے، تو راحم بھی اٹھ کر ان کے ساتھ ہی نکل گیا۔ اس نے ان کی گاڑی کا پیچھا شروع کر دیا۔ سوہا مخصوص اسٹاپ پر اتر گئی، زین اسے آج گھر تک پہنچانا چاہتا تھا۔ مگر سوہا کی کو بھی باتیں بنانے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔ یہ ایک مصروف چوک تھا۔ یہاں کوئی سوہا کا جاننے والا نہیں تھا۔ اس لیے وہ مطمئن تھی۔ اس نے رکتہ پکڑا، اور گھر کی طرف جانے لگی۔ راحم ان کے پیچھے جا رہا تھا۔ اس نے پہلے ہی سے سوہا کا گھر معلوم کر لیا تھا۔ وہ اس کی گلی تک آ گیا۔ سوہا رکتے سے جیسے ہی اتری، راحم نے اس کی

تمہارے حق میں بالکل بھی اچھا نہیں ہوگا۔ تم بس یہ چند دن بالکل بھلا دو۔ ابرار نے آخر میں الفاظ بہت سختی سے ادا کیے۔

”جی سر.....!! مجھے بالکل بھی یاد نہیں ہے۔ آپ اطمینان رکھیے گا۔ میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔ بلکہ میں تو آپ کو جانتا تک نہیں ہوں، اتفاق سے پانی مانگنے کے لیے آ گیا تھا۔“ راحم نے کہا۔ اس نے جاسوسی ناول میں یہ سب پڑھا تھا کہ کام کرنے والے کو آخر میں انجان بننا پڑتا ہے۔

”ڈیس گڈ.....!! اب تم جا سکتے ہو۔“ ابرار نے اٹھتے ہوئے کہا۔ راحم وہاں سے اٹھ کر نکل گیا۔ راحم کے جانے کے بعد ابرار احمد نے وہ ویڈیوز کلپس دیکھنے شروع کر دیے۔ وہ جوں جوں ویڈیوز دیکھ رہا تھا، اس کا غصہ آسان کو چھو رہا تھا۔ کیونکہ اس کو سواہر چرچہ پسند آگئی تھی، مگر اس کا اسٹیشن ہرگز ایسا نہیں تھا کہ اس پر فخر کیا جا سکتا۔ وہ شہر کی تنگ وہ تاریک گلی میں ایک چھوٹے سے ڈرے نما مکان کے اندر رہتی تھی۔ جس گلی میں ابرار کی لمبی گاڑی تک اندر داخل نہیں ہو سکتی تھی۔ اس گھر سے تو ان کے نوکروں کا گھر بڑا اور اچھا تھا۔

”یہ فقیرنی میرے محل کا خواب دیکھ رہی ہے، صورت شہزادی جیسی ہونے سے کوئی شہزادی نہیں بن جاتی۔“ ابرار نے سواہر کو بروچرے کو دیکھ کر کہا۔

”اس لڑکی کو زین کی زندگی سے غائب کرنا پڑے گا، کیونکہ اگر یہ وقت سے پہلے غائب نہ ہوئی، تو زین اس فقیرنی کے لیے کوئی بھی اسٹینڈ لینے کو تیار ہو جائے گا اور ہو سکتا ہے کہ میرا بیٹا اس کی چاہت میں میرے خلاف اٹھ کر باغی بن جائے۔ اس لیے اب ایسا کھیل کھیلنا ہوگا، کہ سانب بھی مر جائے، اور لالھی بھی نہ ٹوٹے۔ میں اس کو ایسا ٹم کبر دوں گا کہ زین اس کے دھول کو بھی نہ پاسکے گا۔“ ابرار کی آنکھوں سے جیسے آگ کے شرارے نکل رہے تھے۔ اس کے سر پر جیسے شیطان سوار ہو گیا تھا۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ وہ سواہر کو غائب کرنا چاہ رہا تھا۔ اس کے لمبوں پر شیطانی سی مسکراہٹ تھی۔ وہ

میں بتا رہے تھے۔ سب کچھ سننے کے بعد ابرار نے موبائل سے سم نکال کر راحم کی طرف بڑھادی، اب وہ موبائل راحم کو نہیں دینا چاہتے تھے کیونکہ اگر سب کچھ ڈیلیٹ کرنے کے باوجود راحم سارا ڈیٹا، ڈیٹا ریکور سے ریکور کر سکتا تھا۔ اور ابرار کوئی بھی رسک نہیں لینا چاہتے تھے۔

”راحم.....!! گڈ بھی واقعی تم نے کمال کر دیا ہے، ویلڈن! آئی ایم ایمپریسڈ.....!! اب میں تمہیں اس موبائل کی جگہ دوسرا موبائل دے دوں گا۔“ ابرار نے موبائل اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ دیا۔ راحم کو اس پر کوئی بھی اعتراض نہیں تھا۔

”تھینکس سر.....!! آپ میرے کام سے خوش ہو گئے ہیں۔ یہی میرے لیے کافی ہے۔“ راحم مسکرایا۔

”راحم.....!! یہ لو انعام! یہ وہ معاوضہ ہے، جس کا میں نے تم سے وعدہ کیا تھا۔ یہ تمہاری محنت کا صلہ ہے۔“ ابرار نے خاکی رنگ کا لفافہ راحم کی طرف بڑھایا۔ راحم نے دھوڑا لیا۔

”سر.....!! یہ چھوٹی سی نوٹ بک ہے، اس میں سواہر کے گھر کا انڈریس موجود ہے۔ میں نے سواہر اور اس کے گھر والوں کا مکمل بائیو ڈیٹا اس میں لکھا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ سواہر کی ڈبلی روٹین کی معمولات بھی اس میں درج ہے۔ اور جو کچھ گفتگو زین اور سواہر کے درمیان ہوئی ہے۔ وہ بھی اپنی طرف سے لکھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ کہاں کہاں ملتے ہیں، کون سی جگہوں پر جاتے ہیں۔“ راحم نے مزے سے ابرار کو بتایا۔ ابرار نے وہ نوٹ بک فوراً لے لی۔

”تھینکس.....!! تم کل آفس آجانا، میرا سیکریٹری تمہیں نیا موبائل خرید کر دے گا۔“ ابرار نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑیں۔

”نہیں سر.....!! اب اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ راحم نے رسمی سا کہا۔

”اوکے ٹھیک ہے۔ راحم آج سے ہم ایک دوسرے کو بالکل بھی نہیں جانتے اور ہاں اس بارے میں کسی سے بھی کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ورنہ پھر

حساس تھا، اپنی کم مائیگی، غربت، افلاس میں اس نے جو زندگی گزاری تھی۔ وہ اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو نہیں دینا چاہتی تھی۔ وہ ان کے لیے کچھ تو آسانی پیدا کرنا چاہ رہی تھی۔

”نو کری لوگ کیوں کرتے ہیں؟ اتنی اچھی تعلیم حاصل کی ہے، اسے کچھ تو اپنے ملک، اپنے فائدے کے کام میں لے آؤں۔“ سوہانے آخر میں ہنس کر اسے دیکھا اس کے ڈمپل میں زین کا دل ابھر کر نکلا۔

”پھر ٹھیک ہے۔ اپنا پی شوق بھی پورا کر لینا۔ اگر کوئی دوسرا مسئلہ ہو تو سوہا تم مجھے بتاؤ، میں حل کر دوں گا۔ کوئی فانی نیشنل پرابلم ہو تو بتا دو۔ میں دل سے کہہ رہا ہوں۔“ زین نے ہنس کر کہا۔

”زین ایسا کچھ نہیں ہے۔ میں اپنے شوق کی وجہ سے جاب کرنا چاہ رہی ہوں۔“ اس نے دوسری طرف دیکھ کر بتایا۔

”اچھا پھر ٹھیک ہے اور تمہاری اسٹڈی کیسی جاری ہے؟“ زین نے اس کے ہاتھوں کو دیکھا۔

”میری اسٹڈی بالکل اے دن جاری ہے۔ تم دیکھنا پورے ڈیپارٹمنٹ میں ہی فرسٹ آؤں گی۔ پورے ڈیپارٹمنٹ میں میرا نام سب سے اوپر ہوگا۔“ سوہا آج کچھ زیادہ ہی خوش لگ رہی تھی۔

”ہاں واقعی تم بہت ذہین ہو، یہ بات مجھے پہلے سے ہی معلوم ہے۔ ویسے ایک بات تو بتاؤ۔ تم یہ ٹنکر کیوں بننا چاہتی ہو؟“ زین نے دونوں آنکھیں اچھی خاصی چھوٹی کر دیں۔

”میری آواز اچھی ہے۔ میری آواز چھا جانے کی طاقت رکھتی ہے۔ سب ایسا ہی کہتے ہیں۔ ویسے تمہیں ایک بات بتاؤں؟“ اس نے معنی خیزی سے زین کی طرف دیکھا۔

”ہاں بتاؤ۔“ زین کو لگا وہ شاید اس سے محبت کا اظہار کرنے والی ہے۔ وہ بہت خوش ہو رہا تھا۔

”زین! تمہاری پرسنلٹی بھی بہت غضب کی ہے، اور تمہارا چہرہ چھا جانے کی طاقت رکھتا ہے۔ تم

کچھ ایر سوچنے کے بعد مطمئن ہو گیا تھا۔ وہ بہت دور تک سوچ چکا تھا۔ بہت دور تک جہاں کسی کی سوچ بھی نہیں پہنچ سکتی تھی۔

☆.....☆.....☆

سوہا پوری تندہی سے پڑھ رہی تھی۔ اس کا ایگزیم قریب قریب تھا، اس کی زندگی میں زین بھی موجود تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو دوست ہی سمجھتے تھے۔ مگر دوستی کے باوجود ایک دوسرے سے شدید محبت بھی کرتے تھے۔ مگر فی الحال ایک دوسرے سے اظہار محبت نہیں کرنا چاہ رہے تھے۔ کیونکہ دونوں اپنی اسٹڈی میں بڑی تھے۔ سوہا گراؤنڈ میں جارہی تھی، چھپچھپ سے زین نے ہاؤ کی آواز سے ایک دم اسے ڈر دیا۔ اس کیہا تھوں میں موجود فائل نیچے گر گئی۔ اس کے سارے اہم کاغذات ادھر ادھر بکھر گئے۔ وہ دونوں ایک ساتھ جھک کر کاغذات اٹھانے کے لیے جھک گئے۔ سوہانے زین کو دیکھا، زین اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ سوہا جلدی جلدی اپنے کاغذات اٹھانے لگی۔

”زین.....!! کیا اسٹڈی مکمل کرنے کے بعد مجھے جاب مل جائے گی۔“ سوہانے اس کی طرف دیکھا۔

”کیا تم اسٹڈی کے بعد جاب کرنا چاہتی ہو؟“

زین کی آنکھوں میں حیرانگی تھی۔

”ہاں.....!! میں جرنلزم فیلڈ میں کسی اچھی پوسٹ پر کام کرنا چاہتی ہوں، جہاں فیم بھی اچھا خاصا ہے اور پیسہ بھی، میرا ایک دوسرا خیال بھی ہے، میں چاہتی ہوں جاب کے علاوہ میں پہلے بیک سنگلنگ بھی کروں۔“

اس نے زین کو دیکھا۔ زین کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا۔ دوسرا جا رہا تھا۔ اس کو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، آج سوہا کو وہ کیا جواب دے، وہ تو اس سے محبت کرتا تھا، وہ اسے جاب کرنے نہیں دینا چاہ رہا تھا۔ زین ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ خود سیشنل ہو کے سوہا کا ہاتھ مانگ لینا چاہ رہا تھا، اس کی بس یہی خواہش تھی۔

”سوہا.....!! تم نو کری کیوں کرنا چاہ رہی ہو؟“ زین نے الٹا اس سے سوال کیا۔ سوہا کو اپنی فیملی کا

تھا۔ وہ دونوں اس وقت ابرار کے سامنے کھڑے تھے۔ اور بہت بادب بین کا مظاہرہ کر رہے تھے۔  
 ”سائیں.....!! کیسے یاد آوری کی؟“ نوری نے پوچھا۔

”ارے.....!! بیوقوفان.....!! سائیں کو کوئی کام ہوگا، تبھی تو ہمیں یاد کیا ہے۔“ سانول نے اسے ٹوکا۔

”جی بالکل.....!! مجھے تم دونوں سے نہایت اہم کام درپیش ہے۔“ ابرار نے گلہ کھکھارا۔  
 ”جی سائیں حکم.....!! وہ دونوں بیک زبان ہو کر بولے۔ ابرار نے ہاتھ کے اشارے سے ان کو اپنے سامنے بٹھادیا۔ اب وہ ان کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ ابرار دونوں کو کچھ دور تک دیکھتا رہا۔

”مجھے تم سے ایک لڑکی کو اغوا کروانا ہے۔“ ابرار کی بات سن کر دونوں خباثت سے مسکرائے۔

”صرف ایک لڑکی کا معاملہ نہیں ہے، اس کے پورے خاندان کو ایک نئی جگہ منتقل کرنا ہے۔ لڑکی جس گھر میں رہتی ہے، وہ اس کا ذاتی گھر ہے۔ ان کو اتنا مجبور کر دینا ہے کہ وہ شہر چھوڑ کر چلے جائیں۔“ ابرار نے دونوں کی طرف دیکھا۔  
 ”ہم کام کر دیں گے، آپ بے فکر رہیں۔“ سانول نے کہا۔

”کام اتنا آسان نہیں ہے، کیونکہ جس لڑکی اور اس کے خاندان کو شہر بدر کرنا ہے، وہ لڑکی یونیورسٹی میں پڑھ رہی ہے۔ سب سے پہلے تو اس کا یونیورسٹی کا جانابند کرنا ہوگا۔ آج کے بعد وہ یونیورسٹی نہ جاپائے۔ اور یہ کام تم دونوں کا ہے کہ کیسے اس کے گھر والوں کو شہر بدر کرو گے۔“ ابرار نے دونوں کی طرف دیکھا۔

”سائیں.....!! کام بہت بڑا ہے، مگر چند مشکل نہیں ہے۔ ہو جائے گا۔ لڑکی اور اس کے گھر والوں کی معلومات دے دیں۔“ سانول نے کہا۔

”لڑکی کا نام سوہا ہے۔ اس کا باپ معمولی سا سرکاری ملازم ہے۔ اس کی دو بہنیں اور دو چھوٹے بھائی

ایکٹربن جانا، دیکھو چھا جاؤ گے۔ تمہیں اتنی شہرت ملے گی کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ اسٹڈی جیسے ہی مکمل کر لو۔ سب سے پہلے ایکٹنگ کے بارے میں کچھ سوچنا۔“ سوہانے پتے کی بات کی، جسے سن کر زین زور، زور سے ہنسنے لگا۔

”سوہا.....!! کیا تم سنجیدہ ہو؟“ زین کی ہنسی کو بریک لگ گئے۔

”ہاں زین میں سنجیدہ ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ تم بھی سنجیدہ ہو جاؤ۔ اپنے بارے میں سوچو، میں سگریٹ ایکٹر، دیکھنا ہم دونوں کی دوستی مزید مضبوط ہو جائے گی۔“ ابھی فی الحال تو میں نے دور، دور تک ایکٹر بننے کے بارے میں سوچا بھی نہیں ہے۔“ زین نے مزے سے کہا۔

”تو اب سوچ لو ناں۔“ سوہانے جھٹ سے جواب دے کر اسے سوچنے پر مجبور کر دیا اور زین بھی سوچ میں پڑ گیا۔ وہ دونوں کچھ دیر بات کرنے کے بعد گاڑی میں بیٹھ کر چلے گئے۔ ویسے بھی چھٹی کا وقت تھا۔ زین واقعی سوہا کی اسی بات میں پھنس کر رہ گیا تھا۔ وہ بار بار یہی سوچ رہا تھا۔ اس کے کانوں میں سوہا کی آواز گونج رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

ابرار نے اپنا کھیل شروع کر دیا تھا۔ سندھ کے انہر اس کے دو بڑے واقف کار تھے۔ ایک کا نام سانول تھا، وہ اونچے قد کا ٹھکا ٹھکا لک تھا، اور نچلے رنگت کا کالا آدمی تھا۔ صحت مند سڈول سا بندہ تھا۔ اس کا جسم کسی دیو کی طرح تھا۔ اور دوسرا نور البشر تھا۔ اس کو سب نوری کے نام سے جانتے تھے۔ وہ غلط کاموں کا ماہر تھا۔ یہ دونوں ہر قسم کے غلط کاموں میں ملوث تھے۔ اور ہر قسم کی بد معاشی میں مبتلا تھے۔ دونوں سندھی لب و لہجے میں اچھی خاصی اردو بول لیتے تھے۔ ابرار نے پہلے بھی ان سے اچھا خاصا کام لیا تھا۔ ابرار احمد نے ان کو نوں کر کے اپنے بنگلے پر بلوایا تھا۔ یہ بنگلہ عرصے سے خالی تھا اور ابرار اسے اپنے ذاتی کاموں کے لیے استعمال کیا کرتا

دونوں ہاتھ اٹھا کر سستی سی نکالی۔

☆.....☆.....☆

ابرار یہ سب کچھ اس لیے کروا رہا تھا۔ کیونکہ وہ ایک با اثر شخص تھا، بڑے لوگ ہمیشہ چھوٹے لوگوں کو کھانا جاتے ہیں، جیسے عموماً بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو نگل لیتی ہیں۔ ابرار ایک بہت امیر ترین انسان تھا، اسے کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ مگر وہ زین کی شادی کسی شہری خوبصورت لڑکی سے ہرگز کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے اس سب کے باوجود اس سے زیادہ کی ہوس تھی۔ وہ زین کی شادی اپنے مالی فائدے کے لیے صورت میں نکیش کروانا چاہ رہا تھا۔ اس کی نظر ملک کی نامی گرامی سیاست پر لگی ہوئی تھی۔ ملک کے بہت بڑے سیاسی لیڈر کی اکلوتی بیٹی پر ابرار کی نظریں تھیں۔ وہ بھی اب بزنس کے علاوہ سیاست کا گندا کھیل کھیل کر اربوں کماتا چاہتا تھا۔ سیاست میں آنے سے پہلے ہی اس نے کسی ماہر شاطر سیاست دان کی طرح بساط بچھا دیا تھا۔ اب اسے کھیلنا تھا۔ اس نے مہارت سے سوہا کی زندگی میں جیسے سیاسی داؤ بیچ شروع کر دیے تھے۔ وہ بزنس میں ماہر تھا۔ داؤ بیچ سمجھ سکتا تھا۔ اپنے نفع نقصان میں جمع تفریق آسانی سے کر سکتا تھا۔ اسے زین کی سوہا سے شادی کر کے نقصان نہیں کرنا تھا۔ ماہ نور جنین وہ لڑکی تھی، جو ابرار کو سیاست کے سیٹ پر پہنچا سکتی تھی۔

اس کا دوست تھا جو ملک کا کامیاب سیاستدان تھا، اس کی اکلوتی بیٹی تھی۔ دولت، جاگیر، رتبے، نام، نسب کی مالک تھی۔ کبھی اس ملک، کبھی اُس ملک، اس کے دورے ہوتے۔ حسین و جمیل، جیسے موم کی گڑیا ہو۔ مگر اس کے بے شمار بوائے فرینڈز تھے۔ کبھی کسی کے ساتھ کبھی کسی کے ساتھ، وہ جیسے لباس کی طرح بوائے فرینڈ تبدیل کرتی رہی تھی۔ مگر شادی تو اسے کسی بڑے گھر لانے میں کرنی تھی۔ ماہ نور جنین زین کو دل سے پسند کرتی تھی۔ اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھی۔ مگر وہ چاہتی تھی، اگر زین نہ صحیح تو زین جیسا ہی کوئی دوسرا صحیح۔ یا پھر اس سے بھی بہتر کا ارادہ رکھتی تھی۔ وہ بہت بے

ہیں۔ گھر خالی کروا کر ان لوگوں کو کسی دور دراز کے گاؤں منتقل کر دینا ہے۔ اس سب میں کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔ لڑکی اگر کسی طریقے سے زندہ ہونے کے باوجود بھی مردوں میں شامل ہو جائے۔ تو کیا ہی اچھا ہوگا۔ ابرار نے دونوں آنکھیں باہر نکال کر کہا۔

”سائیں.....!! لڑکی کی عزت اگر داغدار ہو جائے، وہ خود بخود ہی زندہ ہو کر مردہ ہو جاتی ہے۔“

نوری نے مونچھوں کو تالا ڈیا۔

”نہیں اس کی عزت پر آج نہیں آنی چاہیے۔ اس کو کوڑے میں پہنچانا ہے۔“ ابرار نے دونوں کو معنی خیزی سے دیکھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، وہ ابرار کی بات صحیح سے سمجھ نہ پائے تھے۔

”کوڑے میں.....!!“ ان دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

”ہاں کوڑے میں، جو زندہ ہو کر بالکل مردہ ہوتا ہے، وہ کوڑا ہوتا ہے۔ تم دونوں نے لڑکی کو اغوا نہیں کروانا اسے کوڑے میں پہنچانا ہے۔“ ابرار نے کھل کر بات کی۔

”سائیں.....!! ہم سمجھ گئے ہیں۔ سب کچھ ہو جائے گا۔“

”مجھے بھی تم سے یہی امید تھی، تم دونوں مجھے انکار نہیں کرو گے۔ اس کام میں جتنا بھی پیسہ لگتا ہے میں دوں گا۔“

”جی سائیں آج سے ہم کام شروع کر رہے ہیں۔ بہت جلد آپ کو نتیجہ مل جائے گا۔“ نوری نے سانول کی طرف دیکھ کر کہا۔ سانول نے اس کے ساتھ اتفاق میں سر ہلایا۔ ابرار نے پرسکون سی سانس خارج کی۔ ابرار نے اپنی کوٹ کی جیب سے خاکی رنگ کا لفافہ نکال کر سانول کی طرف بڑھادیا۔ جسے ان دونوں نے قبول کر لیا۔ یہ خاکی رنگ کا لفافہ پیسوں سے بھرا ہوا تھا اور جانے سے پہلے ابرار نے ایک سفید رنگ کی فائل ان کی طرف بڑھائی۔ یہ فائل سوہا کے بارے میں تھی۔ وہ دونوں اب بنگلے سے باہر جا رہے تھے۔ ابرار نے

باک لڑکی تھی۔

انوالو کرنے کی کوشش کی، تو دوبارہ بالکل بھی فون نہیں کرینگے بلکہ ان ننھے فرشتوں کی لاشیں ملیں گی۔ شاہ زر بہت ڈر گئے تھے۔ وہ کوئی بھی خطرہ اٹھانا نہیں چاہ رہے تھے۔ باپ نے صرف سوہا کو بتایا تھا۔ وہ مسلسل رورہی تھی۔ شاہ زر نے اسے سختی سے ڈانٹ دیا تھا۔ وہ کوئی بھی رسک نہیں چاہتا تھا۔ سوہا کو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس نے باپ کو راضی کرنے کی کوشش کی کہ پولیس کو بتاتے ہیں۔ مگر شاہ زر انتہائی ڈر گئے تھے۔ کیونکہ اغوا کاروں نے اس کو شام کو فون کرنے کو کہا تھا اور شام میں کافی وقت تھا۔ سوہا نے سوچا بھی تھا کہ زین سے اس بارے میں بات کرنی چاہیے۔ مگر شاہ زر کے منع کرنے پر اس نے زین سے کچھ رابطہ نہ کیا۔ شاہ زر نے سوہا کو رونے سے بھی منع کر دیا تھا۔ کیونکہ وہ اگر روتی رہتی، تو یقیناً پڑوسیوں کو خبر ہو جاتی۔ اس نے اپنے آنسو پونچھ لیے۔ اگر بات گھر سے نکلتی، تو پورے شہر میں پھیل جاتی۔ اور بات اسے گھر سے باہر نکالنی نہیں تھی۔

شاہ زر، زندگی میں پہلی بار اس قدر پریشان ہو گئے تھے۔ حالانکہ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔ وہ کیا کرے؟ کہاں جائے؟ وہ بس بے چینی سے ٹہل رہے تھے۔ اس نے کام سے چھٹی کر لی تھی۔ سوہا نے دل ہی دل میں خود کو تسلی دی تھی کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مگر سب ٹھیک نہیں ہونے والا تھا۔ اگلا فون شاہ زر کو تین گھنٹے بعد ملا۔ یہ تین گھنٹے اس نے جیسے کانٹوں پر کھڑے ہو کر گزارے تھے۔

”بیلو.....!! شاہ زر نے بے چینی سے کہا۔

”خاموش“.....!! دوسری جانب سے ڈانٹ کر

کہا گیا۔

”ہاں.....!! سن رہا ہوں“۔ شاہ زر بے بسی

سے بولے۔ کچھ دیر تک خاموشی چھائی رہی۔

”آپ کیا چاہتے ہیں، میں تو ایک غریب بندہ

ہوں“۔ شاہ زر نے خود یہ خاموشی توڑ دی۔

”جپ.....!! تمہیں خاموش رہنے کو کہا گیا ہے۔

اگر دوبارہ کچھ بھی بولے تو ہم کال نہیں کریں گے۔ تم نے

ماہ نور جبین، ہر وقت تک، سک سی تیار رہتی، وہ کسی بار بی ڈول سے کم نہ تھی۔ مگر زین کو بار بی ڈول جیسی لڑکیاں قطعاً پسند نہ تھیں۔ وہ اسے پلاننگ کی لڑکی سمجھتا تھا۔ زین کی ماں زرتاشہ ماہ نور جبین کو پسند بھی بہت کرتی تھی۔ وہ جس سرکل میں موو کرتی تھی۔ ماہ نور جبین وہاں کے لیے پرفیکٹ میچ تھی۔ اس کا بھی کوئی غربت میں پلی، بھوک زدہ، افلاس کی ماری حسینہ کو بہو بنانے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ زرتاشہ اور ابرار کا مشترکہ فیصلہ تھا، وہ ماہ نور جبین کو بہو بنانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ زرتاشہ نے ابرار کا فیصلہ دل پر نقش کر لیا تھا۔ مگر وہ کہتے ہیں ناں.....!! کہ بساط دل بھی عجیب شے ہے۔ زین کا دل تو سوہا کے پاس تھا۔ وہ کیسے ماہ نور جبین کا ہوسکتا تھا۔ سو پہلے وہ زرتاشہ کو ٹالتا رہا، مگر جب وہ زیادہ اس کے پیچھے پڑ گئی۔ تو اس نے زرتاشہ کو صاف ٹال دیا۔ زرتاشہ نے ابرار کو بتایا کہ زین کسی کو پسند کرتا ہے، مگر اس کا نام نہیں بتا رہا ہے۔ تب سے ابرار کی نیندیں اڑی ہوئی تھیں، ابھی اس نے کافی سوچنے کے بعد زین کی جاسوسی کرنے کا فیصلہ شروع کر دیا اور راحم کو ہار کر لیا۔ راحم نے اپنا کام عمدہ طریقے سے کیا۔ اب ابرار سوہا کی زندگی میں زہر گھولنا چاہتا تھا۔ وہ سوہا سے زین شادی کر کے خسارہ کرنا نہیں چاہتا اور زین اگر ماہ نور جبین سے شادی کر لیتا تو ابرار کو سکون مل جاتا۔ اس کا سیاسی کیریئر بھی شروع ہو جاتا، یہاں جیسے ہر کسی کو اپنی پڑی ہوئی تھی۔ ابرار نے زین کی زندگی سے بالکل اسی طرح سوہا کو نکالنا چاہا۔ جیسے زین نے بلا اجازت سوہا کو اپنی زندگی میں شامل کیا تھا۔ اس کام کے لیے اس نے دو مجرم بندے ہار کر دیے تھے۔

☆.....☆.....☆

یہ خبر شاہ زر کے لیے سوہا کی روح تھی۔ اس کے دونوں بیٹے آشان اور کا شان اغوا ہو چکے تھے۔ شاہ زر کو اغوا کاروں نے فوراً اطلاع کر دی تھی۔ اغوا کاروں نے بڑی ہی بے رحمی سے بتا دیا تھا کہ اگر پولیس یا میڈیا کو



ہماری بات سننی ہے اور صرف عمل کرنا ہے۔ بولنا ہمیں ہے۔“ شاہ زر کے کانوں میں بھاری آواز سنائی دی۔ کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔

”ہم تمہارے دونوں لڑکے آزاد کر سکتے ہیں۔ مگر اس کے لیے ایک شرط ہے۔“ بات قصداً دھوری چھوڑ دی گئی۔

”کک۔۔۔ کک۔۔۔ کیسی شرط، میں ہر شرط ماننے کو تیار ہوں۔“ شاہ زر ہکا گیا۔

”تم لوگ یہ شہر چھوڑ کر کسی دور دراز کے گاؤں چلے جاؤ۔ تمہارے پاس آج رات تک کا ٹائم ہے۔ سامان پیک کرنا شروع کر دو۔“ شاہ زر سمجھ ہی نہیں سکا کہ انہوں کا کیا مطالبہ کر رہے ہیں۔

”مگر!!! میں کیسے ایک دم سے یہاں سے کہیں چلا جاؤں؟“ شاہ زر حیرت سے پوچھ بیٹھا۔

”یہ سوچنا تمہارا کام ہے، ہمارا نہیں۔“ ایک بار پھر سے اس کے کان میں آواز آئی۔

”یہاں سے میں کیسے جا سکتا ہوں؟ میرا سب کچھ یہاں ہے۔“ شاہ زر گہرا کرومضاحت دینے لگا۔

”ہم جو کہہ رہے ہیں، وہ کرو، یہ سب تمہارا درد سر ہے۔ ہمارا نہیں، گھر کو تالا لگاؤ، اپنا سارا سامان اٹھاؤ اور یہاں سے کسی ایسی جگہ دفع ہو جاؤ۔ جہاں تمہیں کوئی جانتا پہچانتا نہیں ہو۔“

”مگر کیوں؟ کوئی وجہ تو بتاؤ؟“ شاہ زر کو اس وقت انہوں کا رکے مطالبے پر حیرت ہو رہی تھی۔ وہ اس کو پاگل سمجھ رہے تھے۔

”جو کہا گیا ہے، وہ کرو۔ ورنہ تمہارے بیٹے کل کسی کچرا کنڈی میں پڑے ہوں گے اور وہ بھی مُردہ“.....!! شاہ زر کو ایک بار پھر دھمکایا۔

”میں جا رہا ہوں، مگر خدا کے لیے میرے بچوں کو۔ کچھ مت کرنا وہ معصوم ہیں۔ اور میں نہیں جانتا کہ ان سب کے پیچھے کیا وجہ ہے؟ اگر تم لوگ بتا دیتے تو دل کو تسلی تو رہتی کہ میں اپنا شہر کیوں چھوڑ کر ہجرت کر رہا ہوں۔“

”وجہ یہ ہے، سنو.....!!! وڈے سائیں کو تمہاری

بڑی لڑکی سوہا پسند آگئی ہے، یہ نہ ہو کہ وہ تمہاری لڑکی کو اغوا کر وادے۔ اگر تم یہ شہر چھوڑ کر آج رات تک چلے جاؤ گے۔ تو یہ ہمارا تم سے وعدہ ہے کہ ہم تمہارے دونوں لڑکے خود تم تک پہنچا دیں گے۔ ہمارے بندے تم لوگوں پر مستقل نظر رکھ رہے ہیں۔ ہم سامان لے جانے کے لیے گاڑی بھجوا رہے ہیں۔ تم لوگ اس میں سارا سامان ڈال دو اور گاڑی والے کے ساتھ چلے جاؤ۔ جہاں تم کہو گے، وہ تمہیں چھوڑ دیں گے۔ ہمارا سامان تمہاری بیٹی کی چاہ کر رہا ہے۔ مگر کچھ لوگ ہیں جو اسے سائیں سے بچانا چاہ رہے ہیں۔ ہم تمہارے بھلے کے لیے کہہ رہے ہیں۔ تمہارے پاس رات کے وقت ٹرک پہنچ جائے گا۔ ابھی سے سامان اٹھانا شروع کر دو۔“ شاہ زر نے بیٹیوں سے سامان پیک کرنے کو کہا۔ سوہانے کافی بار پوچھا۔ مگر شاہ زر نے کچھ نہ بتایا۔ وہ اپنے دونوں بیٹیوں کے لیے اتنا تو کر ہی سکتا تھا اور پھر معاملہ اس کی بیٹی کا تھا۔ یہ وڈیرے، سائیں، لوگ بہت ظالم ہوتے ہیں۔ سوہا کے بارے میں سن کر جیسے اس کے پیروں سے زمین نکل گئی تھی۔ اسے بھی لگنے لگا کہ وہ جو کوئی بھی ہے، ان کے بھلے ہی کے لیے ہی کہہ رہے ہیں اور باتیں بہت ہی خوفناک کر رہے تھے۔ اگر سوہا اتنا ہو گئی۔ تو اس کی عزت گھر بیٹھے ہی نیلام ہو جاتی۔ باقی بیٹیوں کا مستقبل تاریک اور ایک سوالیہ نشان بن کر رہ جاتا۔ اس کے آنکھوں کے آگے ایک اندھیرا سا چھارہ ہوا تھا۔ مگر ابھی یہ ہوش کھونے کا وقت نہیں تھا۔ وہ باپ تھے اس کے کندھے ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے۔ وہ لوگ بہت تیز تھے بہت تیزی سے کام کرنا چاہ رہے تھے۔ اس کے کان سے ابھی بھی فون لگا ہوا تھا۔

”یہ لو اپنے بیٹے سے بات کر لو۔“ شاہ زر کے کان میں آواز آئی۔

”ابو.....!! موبائل میں آشان کی آواز سنائی دی۔ آشان تم ٹھیک تو ہونا اور کا شان کیسا ہے؟“ شاہ زر ٹپ کر بول پڑے۔

”ابو.....!! میں ٹھیک ٹھاک ہوں، ان لوگوں

نے کا شان کو کہیں دوسری جگہ رکھا ہوا ہے۔ مجھے نہیں پتہ وہ کیسا ہے؟ آستان کی آواز میں کا شان کے لیے تشویش پائی جاتی تھی۔

”بس.....!! تم نے اپنے بیٹے سے بات کر لی۔ اب آستان سے تب بات ہو سکے گی۔ جب تم ہماری بات مان لو گے۔“ موہا پل میں کسی کی گھمبیری آواز ابھری۔ ”ہاں۔۔۔ میں آپ کی بات ماننے کے لیے تیار ہوں، میں یہ شہر چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ مگر میرے بچوں کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ ہم آج رات کو ہی نکل جائیں گے۔ مگر خدا کے لیے تم میرے بچوں کو کچھ نقصان نہ پہنچانا۔ ہم بس ضروری ساز و سامان لیں گے اور یہاں سے ہمیشہ کے لیے چلے جائیں گے۔“

”ٹھیک ہے، اس شہر سے تم لوگ نکل جاؤ، تمہارے بچے خیر سے پہنچ جائیں گے۔“ دوسری طرف سے شاہ زر کے کانوں میں اسی کی آواز آئی۔

”ہاں۔۔۔!! تمہاری بہت مہربانی ہوگی۔ ہم جا رہے ہیں۔“ شاہ زر نے دھیمے لہجے میں کہا۔

”جتنی جلدی ہو سکے، چلے جاؤ۔ ہمارا وڈا سائیں، ملک سے کل واپس آ رہا ہے۔ اگر اس کو خبر ہوگئی۔ تو تمہاری بیٹی سوہا کی بالکل بھی خیر نہیں۔ یقیناً تم سمجھ دار ہو۔ سمجھ گئے ہوں گے۔“

☆.....☆.....☆

سانپ کا کاٹا توری سے بھی ڈرتا ہے۔ وہ تو آستان اور کا شان کے اغوا سے اتنے ڈر گئے تھے۔ اب سوہا کا نام آ رہا تھا۔ تو وہ تھر تھر کانپ اٹھا۔ سوہا میں تو اس کی جان تھی۔ پتہ نہیں یہ کون سائیں تھا۔ جو اس کے خاندان کا دشمن بن گیا تھا اور سارا کھیل ہی عجیب تھا، سوہا کو بچانے کی خاطر اس سائیں کے آدمیوں نے اس کے بچوں کو اغوا کر لیا تھا۔ اور اب مطالبہ کر رہے تھے کہ کسی نا معلوم مقام پر چلے جائیں۔ شاہ زر کے کان کے ساتھ موہا پل لگا ہوا تھا۔ اس نے وہ جیب میں رکھ دیا۔ اس نے سوہا، روہا کو بلا کر سامان سمیٹنے کے لیے کہہ دیا۔ شاہ زر کے پیروں میں جیسے پیسے لگ گئے تھے۔ اس نے فیصل آباد

کے ایک دور دراز کے گاؤں میں جانے کا فیصلہ کر لیا۔ کیونکہ اس کے وہاں ایک رشتے کی بہن زرینہ بیابھی گئی تھی۔ وہ زمیندار بنی تھی۔ اچھی خاصی زمین کی مالکن تھی۔ اس نے اس مشکل وقت میں وہاں جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے بڑوں کا تعلق بھی فیصل آباد سے تھا۔ اس نے اپنا بچپن وہی گزارا تھا۔ ان کا آبائی گھر وہیں تھا۔ وہاں اس کا ایک دس مرلے کا گھر بھی تھا۔ اس گھر کو عرصے سے تالا لگا ہوا تھا۔ اس کی وہ بہن اس گھر کی کبھی بکھار دیکھ بھال کر لیتی تھی۔ مگر ان لوگوں کا وہاں اتنا آنا جانا نہیں تھا۔ اس لیے کبھی بکھار فون پر بات ہو جاتی تھی۔ اس نے وہ گھر کبھی نہیں بیچا تھا۔ زرینہ بہن نے نئی بار اس کو فون پر بتایا تھا کہ گاؤں والے گھر خریدنا چاہ رہے ہیں۔ اب شاہ زر کو اپنا فیصلہ بہت اچھا لگا تھا۔ زرینہ بہن کچھ مہینے بعد گھر کو کھول کر صفائی ستھرائی کر لیا کرتی تھی۔ گھر چکی مٹی کا بنا تھا، اس کی چھت لکڑی کی تھی۔ مگر اپنا تھا۔ اپنا گھر تحفظ کا احساس دلاتا ہے۔ بے گھر نہیں ہونا پڑتا۔ زرینہ اس کی پچازاد بہن تھی۔ جب اس کی شادی ہوگئی اور اسے کراچی میں نوکری مل گئی، تو اس نے فیصل آباد کو جیسے خیر باد کہہ دیا۔ اس کا باپ تو عرصہ ہوا فوت ہو چکا تھا۔ اب ماں بھی نہیں رہی تھی۔ تو اس نے کراچی جانے کا فیصلہ کر لیا۔ پھر یہاں کراچی میں کسی جاننے والے نے اس کی شادی زینت بیگم سے کرادی اور یوں وہ رفتہ رفتہ شہر میں رچ بس گیا۔ اب وہ واپس اپنے گاؤں آ رہا تھا۔ کافی کچھ بدل چکا تھا۔ جیسے وہ خود بہت بدل چکا تھا۔

کئی سالوں کے بعد شاہ زر کو وہی اپنا گھر جائے پناہ لگا تھا۔ سوہا اور روہا سامان پیک کر رہی تھیں۔ زوہا سب کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ دھیرے دھیرے سارا سامان پیک ہوتا گیا۔ اچانک گلی میں ٹرک کی آواز آئی۔ شاہ زر گھر سے باہر نکلا۔ وہ کوئی انجان آدمی تھا۔ جو شاہ زر کا منتظر تھا۔ رات کے اس وقت گلی میں لوگ نہ ہونے کے برابر تھے۔ شاہ زر نے ٹرک والے کی مدد سے سامان اٹھانا شروع کر دیا۔ اب سامان ٹرک میں منتقل ہو رہا تھا۔ شاہ زر نے زینت بیگم کی جیولری بھی بچا کر رکھی تھی۔ اس

بیگ میں نہیں ملا۔ اب وہ زرینہ کے گھر تھی۔ زرینہ نے ان کو رات کے اس وقت کمرے میں بھیج دیا تھا۔ کیونکہ وہ اسے اس وقت مزید پریشان نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔ وہ بھی رات کی جاگی ہوئی تھی۔ پریشانی سے لیٹتے ہی سو گئی۔ زرینہ، آستان اور کاشان کو نہ دیکھ کر خود انھن کی شکار ہو گئی تھی۔ مگر شاہ زر سامان کے پاس کھڑے تھے۔ اس لیے اسے لگا کہ شاہ زر کے ساتھ ہوں گے۔ اس کو خود سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس وقت کیا پوچھے۔ رسی جملے تو خوب چلے تھے۔ چائے پلانے کے بعد اس نے بچیوں کو کمرے میں بھیج دیا تھا۔ شاہ زر کچھ دیر میں آنے والا تھا۔

☆.....☆.....☆

سامان جیسے ہی سیٹ ہوا، شاہ زر گھر کے اندر چلے گئے۔ اسے بے چینی سے انگو اکاروں کے فون کال کا انتظار تھا۔ شاہ زر کو ایک پل کہیں چین نہیں مل رہا تھا۔ وہ آنگن میں پریشانی سے کھڑا تھا، اس کی نظریں موبائل اسکرین پر لگی ہوئی تھیں۔ اچانک اس کا موبائل بجنے لگا۔ وہی پرائیویٹ نمبر دکھانظر آ رہا تھا۔

اس کے دونوں بیٹے ابھی تک ان کے قبضے میں تھے۔ ”ہیلو“.....!! اس نے پہلی ہی نیل پر کال پک کر لی تھی۔

”ہیلو“.....!! دوسری طرف سے گھمبیر آواز سنائی۔

شاہ زر کچھ نہ بولا۔ اس کی سانسوں پر جیسے بن آئی تھی۔ تم نے ہمارا کہا مان کر عقل مند کی کاثبت دے دیا ہے۔ تمہارے دونوں بچے اس وقت تمہارے بہت قریب ہیں۔ تم گاؤں کی پکی سڑک تک آ جاؤ۔ وہاں پر تمہیں تمہارے بیٹے مل جائیں گے۔ رابطہ منقطع ہو گیا۔ شاہ زر ہیلو، ہیلو کرتا رہ گیا، مگر اس کا موبائل کی ٹوکی آواز سنائی دیتی رہی۔ شاہ زر گھر سے پاگلوں کی طرح نکلا اور ڈورتا ہوا پکی سڑک تک جانے لگا۔ اس کی سانس جیسے پھول رہی تھی۔ وہ جیسے ہی پکی سڑک پر پہنچا۔ وہاں اس کے دونوں بچے بڑے ہوئے تھے۔ اس کے اوپر کمبل ڈالا گیا تھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر ایک گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی ہیڈ لائٹ روشن تھی۔ مگر گاڑی کے اندر گھپ اندھیرا تھا۔ شاہ زر کو دیکھتے ہی

نے وہ بھی نکالی اور ایک گھنٹے میں سارا سامان ٹرک میں ڈالا جا چکا تھا۔ محلے والوں نے ایک دم جانے کی وجہ پوچھی۔ تو اس نے ٹال دی۔ کہا کہ چند مہینوں بعد واپس آ جائیں گے اور یوں وہ اس شہر سے ہمیشہ کے لیے نکل آئے۔ شاہ زر کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس کے بچیوں کے چہرے سوالیہ نشان بن گئے تھے۔ سو بہت زیادہ رو رہی تھی۔ روہا کے بدن میں جیسے لہو خشک ہو گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

جیسے ہی ان کا ٹرک شہر سے نکلا۔ اس کا پیچھا شروع ہوا، نوری اور سانول کے شیطانی منصوبے نے سارا کام آسان کر دیا تھا۔ نوری فرنٹ سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ سانول ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ ان دونوں نے کئی غیر قانونی کام کامیابی سے کئے تھے۔ وہ دونوں کافی فاصلے سے ٹرک کا پیچھا کر رہے تھے۔ وہ شاہ زر کو گم نہیں کرنا چاہتے تھے۔ پیچھے سیٹ پر دونوں بھائیوں کو بے ہوش کرا کر لٹا دیا تھا۔ اس پر ایک چھوٹا سا کمبل ڈال دیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ سو رہے ہوں۔ بہت احتیاط سے یہ کام ہو رہا تھا۔ وہ گاڑی بھی آہستہ چلا رہے تھے۔

ساری رات گاڑی چلتی رہی۔ ڈرائیور ٹرک تیز چلا رہا تھا۔ شاہ زر سمجھ ہی نہ سکا کہ کوئی ان کا پیچھا کر رہا ہے۔ وہ ڈرائیور ان کا ہی آدمی تھا۔

اب وہ لوگ فیصل آباد کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں موجود تھے۔ شاہ زر نے زرینہ کو فون کر کے آنے کی اطلاع دے دی تھی۔ جہاں ٹرک رکا، وہاں سانول نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ شاہ زر کو کچھ علم نہ ہو سکا کہ کوئی اس کے پیچھے یہاں تک چلا آیا ہے۔

ڈرائیور نے اس کا سامان اتارا۔ اس نے بچیوں کو زرینہ کے گھر بھیج دیا۔ اور خود کچھ لوگوں کی مدد سے سامان اٹھا کر گھر کے اندر لے جانا شروع کر دیا۔ سوہا اس سب سے بے حد پریشان ہو گئی تھی۔ مگر سارے سامان میں اس کا موبائل ادھر ادھر ہو گیا تھا۔ وہ اب زین کو بتانا چاہ رہی تھی۔ مگر اب بتانے کا کیا فائدہ۔!! وہ تو میلوں دور آ گئی تھی۔ اس نے اپنا موبائل کافی ڈھونڈا۔ مگر اسے اپنے

گاڑی والے چلے گئے اور شاہ زر کو کچھ اندازہ نہ ہو سکا، کہ وہ کون تھے؟ شاہ زر بچوں کے قریب بیٹھا اور ان دونوں کو چومتا چلا گیا۔ وہ جیسے بے اختیار ہو گیا تھا۔ وہاں ایک کاغذ پڑا ہوا تھا۔ شاہ زر نے لپک کر وہ اٹھایا۔ اس پر کچھ لکھا تھا۔ اب وہاں کوئی گاڑی نہیں تھی۔ وہ گاڑی چلی گئی تھی۔ شاہ زر کو لگا، واقعی وہ لوگ اس پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ شاہ زر نے دونوں بچوں کو اٹھایا۔ اور اسے گھر لے جانے لگا۔ اس نے وہ تہہ کیا ہوا کاغذ جیب میں رکھا۔ وہ بڑی مصیبتوں سے گھر پہنچ گیا۔ گھر پہنچ کر اس نے آستان اور کاشان کو پٹنگ پر لٹا دیا۔ اور خود وہ کاغذ جیب سے نکال کر پڑھنے لگا۔

”تم اپنے گھر والوں کے سارے موبائل سم ابھی سے بند کر دو۔ ہم نہیں چاہتے کہ دوبارہ تم یا تمہاری بیٹی کا موبائل نمبر آن ہو جائے۔ ٹھیک ایک گھنٹے بعد ہم دوبارہ کال کریں گے، ہمیں تمہارے سارے نمبر بند ملنے چاہئیں، دوبارہ یہ نمبر کبھی غلطی سے بھی آن نہ کریں۔ ہمارا سائیں آنے کے بعد تمہاری بیٹی کو تلاش کرے گا۔ تم لوگ کبھی دوبارہ شہر کا رخ غلطی سے بھی نہ کرنا۔“ کاغذ پر جو کچھ لکھا تھا۔ شاہ زر کو اب وہی کرنا تھا۔ وہ حکم عدولی کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے جیب سے موبائل نکالا اور سم نکال کر منہ میں ڈال کر خراب کر دی۔ اس نے سوہا کے موبائل سے بھی سم نکالی اور اس کو بھی خراب کر دیا۔ سوہا کا موبائل اسے سامان میں ملا تھا۔ اس نے وہ موبائل بھی کہیں پھینک دیا۔

”میں دوبارہ کبھی بھی شہر نہیں جاؤں گا۔ اور نہ اپنے بچوں کو کبھی دوبارہ شہر کا رخ کرنے دوں گا۔“ شاہ زر نے دونوں بیٹیوں کے پاس لیٹ کر کہا۔

اچانک آستان ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا، باپ نے اسے دیکھا، اور چونے لگا۔

”بیٹا.....!! تمہیں ان لوگوں نے کچھ کہا تو نہیں؟“

”نہیں.....!! ان لوگوں نے میرا خیال رکھا تھا، وہ کہہ رہے تھے۔ وہ لوگ آپ کے دوست ہیں۔“ آستان نے معصومیت سے بتایا۔

”ہاں....!! بیٹا ان لوگوں نے تم سے ٹھیک کہا تھا۔ اب ہم یہاں رہیں گے۔ تم یہ بات کسی کو بھی مت بتانا۔“ ”جی ابو نہیں بتاؤں گا۔“ آستان نے کہا۔ وہ دونوں کچھ دیر باتیں کرتے رہے، کچھ ہی دیر میں کاشان کو بھی ہوش آ گیا۔ باپ نے اسے بھی سمجھا دیا۔ وہ بہت سمجھدار بچے تھے۔ فوراً سمجھ گئے۔ اس نے بھی باپ سے وعدہ کر لیا کہ وہ کسی کو کچھ بھی نہیں بتائیں گے۔ تب جیسے شاہ زر کی جان میں جان آئی۔ شاہ زر نے پہلے ہی موبائل سے سیم نکال کر دانتوں سے توڑ ڈالی تھی۔ اب اسے کچھ فکر نہ تھی۔ وہ چھت کو کافی دیر تک گھورتا رہا۔ اس نے کچھ آگے کا سوچنا تھا۔ جیسے وہ اس وقت پریشان تھا۔ اس گاؤں میں اسے اپنا مستقبل سوالیہ نشان نظر آ رہا تھا۔ صبح تنک سوہا، روہا اور زوبا آچکی تھیں۔ ان کے ساتھ زربینہ چچی بھی تھی۔ وہ تشویش کا شکار تھی۔ مگر جب آستان اور کاشان کو دیکھ لیا، تو اس کی تشویش جاتی رہی۔ اب وہ گھر کے سامان سیٹ کر رہے تھے۔ سارے بچے یہاں آکے بے حد پریشان تھے۔ مگر زباپ نے سب کو کچھ بھی بتانے سے منع کر دیا تھا۔ بچوں کا گاؤں میں بالکل بھی دل ہی نہیں لگ رہا تھا۔ مگر دھیرے دھیرے وقت گزرنے لگا۔ شاہ زر نے سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔ وہ یہاں آکے رچ بس گیا تھا۔ اس کو اپنا گھر اپنا دفتر سب کچھ یاد آتا تھا۔ مگر وہ اب بھی نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہ ایسی نوکری کا کیا کرتا، جو اس کے بچوں کو کھانا جائے۔ اسے ڈر لگتا تھا۔ مگر اس نے بہت سوچا۔ پر یہ کتنی سلیجھ نہ پائی۔ وقت کا یہ بھی گھومنا شروع ہو گیا تھا۔ سیکنڈ، منٹس میں تبدیل ہو کر گھنٹوں کا سلسلہ طے کر گئے۔ گھنٹے دنوں میں تبدیل ہوتے گئے اور کچھ مہینے گزر گئے۔ سوہا اور زین جدا ہو گئے۔ سوہا جلتے گلاب میں کیسے مقید ہو گئی۔ اس راز کو جاننے کے لیے پڑھتے رہے جلتے گلاب۔۔۔!! کیا زین اپنے باپ کو روک سکے گا؟ یا ابراہ کے گر گئے جلتے گلاب کو سمندر برد کر کے سوہا کو مار دیں گے۔۔۔!!

(باقی آئندہ ماہ انشاء اللہ۔۔۔!!)



# جلتے گلاب

عثمان غنی خان - پشاور

قسط نمبر: 3

دو دلوں کا ملاپ اچانک چھناکے سے بکھر گیا، دونوں کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اس قدر عجلت میں وہ ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گے اور جب ایسا ہوا تو ایک انوکھا شاخسانہ سامنے آیا تو انجان سفر کے باسی گھٹ کر رہ گئے لیکن جب وقت پلٹا تو.....

ایک اچھوتی انوکھی دلنواز، فرحت بخشی دل دماغ کو گدگداتی..... شاہکار کہانی

ہوا تھا۔ مگر وہ اپنا غم کسی پر آشکار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کے گھر میں اس کی شادی کے تذکرے شروع ہونے لگے تھے۔ مگر وہ کسی صورت ماہ نور جبین سے شادی کر کے صاف تمیز کر سکتا تھا۔

ماہ نور جبین وہ لڑکی کبھی نہیں بن سکتی تھی، جو زین کی شریک سفر کہلائی جاسکتی اور پھر بہت سارا وقت گزر گیا۔ ان گزرتے وقت میں کوئی ایسا لمحہ نہ تھا، جب زین نے سوہا کا نمبر ملایا ہو۔ مگر ہر دن اسے مایوسی ملی تھی۔ اس عرصے میں اسے رمشال شاہ ملی، اس نے رمشال شاہ سے دوستی کر لی، مگر وہ اس کو دل بھی نہیں دے سکتا تھا، کیونکہ اس کا دل پہلے سے ہی کسی کے پاس تھا۔

زین کو سوہا جلتے گلاب کے اندر دکھائی دی، اسے ایسے مخوش خواب بھی اکثر نظر آتے تھے۔ مگر زین نے کبھی ان خوابوں پر یقین نہیں کیا تھا۔ وہ اکثر سوہا کی سلامتی کے لیے خدا سے دعائیں مانگا کرتا تھا۔ اسے اب یہ سارا معاملہ جاویدی سا لگتا تھا۔ اس نے یہ کتنی سلجھانے کی بہت کوشش کی تھی۔ مگر اب اسے اس سارے معاملے کا سرا مل گیا تھا۔ وہ سراسر اس کا اپنا باپ تھا۔ ابراہیم مگر اسے اب بھی کچھ سمجھ نہیں آتی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا، سوہا کیسے جلتے گلاب میں مقید ہو گئی، کون

**زین** سوہا کے غائب ہونے پر بے حد پریشان تھا۔ اس نے اس کو ہر جگہ ڈھونڈا، جہاں اس کے ملنے کا ایک بھی فیصد امکان تھا۔ مگر وہ تو ایسے گم ہو گئی تھی۔ جیسے سوئی بھوسے کے ڈھیر میں گم ہو جاتی ہے۔ پہلے تو اسے لگتا رہا، کہ وہ لوگ کسی رشتے داروں کے ہاں گئے ہوں گے۔ اس نے شاہ زر کے بارے میں بھی معلومات لینے کی کافی کوشش کی۔ جہاں شاہ زر کام کرتا تھا۔ اسے وہ جگہ مل گئی۔ مگر وہاں اسے شاہ زر نہ ملا۔ وہ کئی دن تک مسلسل شاہ زر کے آفس جاتا رہا۔ مگر شاہ زر اسے نہ ملا۔ وہ خود شدید حیران تھا۔ وہ سوہا کا نمبر دن میں سو مرتبہ ملاتا۔ مگر وہ کبھی آن ہی نہیں ہوتا۔ وہ خود سخت پریشان تھا۔ اس کو کچھ بھی سمجھ میں آ رہا تھا۔ کہ وہ کرے تو کیا کرے؟ کس کے پاس جائے، جو اس کی یہ گتھی سلجھا دے۔ مگر کوئی نہیں تھا۔ وہ کچھ بھی نہ کر سکا۔ وہ ہر دن سوہا کا منتظر رہا۔ اب تو وقت گزرتا رہا۔ اس نے سوہا کی خواہش پوری کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ ٹی وی ڈراموں میں اداکاری کرنے لگا۔ اور کروڑوں دلوں کی دھڑکن بن گیا۔ مگر جس کی اسے تلاش تھی۔ اسے وہ کہیں بھی نہ ملی۔ اس کی زندگی جیسے جمود کا شکار ہو چکی تھی۔ وہ باہر سے جتنا زندہ دل لگتا، اندر سے وہ اس سے دگنا ٹوٹا



حیران رہ گئی۔ اس نے اسے کچھ نہ کہا۔ اور وہاں سے چلی گئی۔ ساجل اس کی خاموشی کو مضامندی سمجھ کر اسے چاہنے لگا۔ سوہا اس سے گریز کرنے لگی۔ وہ اس کی گریز کو اس کا شرم و حیا سمجھتا رہا۔ اور یوں ساجل ایک غلط فہمی کا شکار ہو گیا۔ وہ سمجھتا رہا کہ سوہا بھی اس کو دل ہی دل میں چاہتی ہے۔ مگر سوہا نے اس کی غلط فہمی بھی دور نہ کی تھی۔ اب تو وہ اس کے گھر بھی اکثر آنے جانے لگا۔ کبھی شاہ زر سے گپ شپ لگاتا۔ کبھی بچوں سے کھیلتا رہتا۔ مگر جب تک وہ ہوتا سوہا کمرے میں بند ہو جاتی۔

اسے دیکھ کر اسے رونا آ جاتا تھا۔ وہ دل سے دعائیں مانگا کرتی تھی، کہ اللہ اسے اس سے دور کر دے۔ مگر وہ جیسے ایک مسلسل امتحان بن رہا تھا۔ اس نے ہر نماز میں دعائیں کی کہ خدا اسے دوبارہ شہر اپنے گھر لے جائے۔ اس نے شاہ زر سے بھی بات کی۔ وہ آگے پڑھنا چاہتی ہے۔ اپنی تعلیم مکمل کرنا چاہتی ہے۔ وہ ہاسٹل میں رہ لے گی۔ مگر شاہ زر نے صاف انکار کر دیا۔ وہ تو سوہا کی بات سن کر پیسے ڈر چکا تھا۔ وہ سوہا کو سختی سے منع کر چکا تھا کہ وہ دوبارہ ایسا کوئی مطالبہ نہیں کرے گی۔ سوہا نے بھی کچھ نہ کہا اور کمرے میں چلی گئی۔

ایک دن زر مینہ بچنی آئی تھی۔ اس نے ان لوگوں کو دعوت پر بلایا تھا۔ شاہ زر بھی خوش ہو گیا۔ اس نے شام کو آنے کا وعدہ بھی کر لیا تھا۔ شام کو سب لوگ دعوت پر چلے گئے۔ مگر سوہا نے خراب طبیعت کا بہانہ بنا کر انکار کر دیا۔ وہاں ساجل کی بے چین نظریں سوہا کو پناہ پر بد مزہ سی ہو گئیں۔ وہ روہا سے بار، بار سوہا کا پوچھتا رہا۔ مگر روہا اسے یہی بتاتی رہی کہ وہ بیمار تھی۔ جب رات کو وہ لوگ واپس آئے تو بہت خوش تھے۔ سوہا نے کھانا کھا لیا تھا۔ روہا اس کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ وہ اس کے کان میں بار بار ساجل کی باتیں کیے جا رہی تھی۔ یہ باتیں جیسے اس کے لیے کسی امتحان سے ہرگز کم نہ تھیں۔ اس نے اسے بری طرح سے جھڑک دیا اور وہاں سے اٹھ کر آنگن میں چلی گئی۔ وہ کسی طرح سے ساجل کو آگے بڑھنے سے روکنا چاہ رہی تھی۔ مگر وہ جیسے بہت تیزی سے اس کے

ہے یہ بڑے سرکار جس نے اس کی سوہا کو جلتے گلاب کے اندر مقید کر دیا ہے۔ اسے سوہا کے غم کی آزادی کا طریقہ معلوم ہو گیا تھا۔ مگر وہ سارا معاملہ دل سے سلجھانا چاہ رہا تھا۔ اس کو کچھ تو کرنا تھا۔ کیونکہ اگر وہ کچھ نہ کر پاتا، تو سوہا ہمیشہ کے لیے جلتے گلاب کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی۔

اس نے وہ جلتے گلاب کو ان سے چھیننے کا فیصلہ کر لیا۔ مگر یہ مشکل تھا۔ کیونکہ اس کے آگے اس کا باپ ابراہیم احمد کھڑے تھے۔

☆.....☆.....☆

شاہ زر کے بچوں کو دیکھ کر زر مینہ نے کچھ نہ پوچھا۔ وہ لوگ تو اب گاؤں میں سیٹ ہو چکے تھے۔ سوہا کو زرین کی یاد کچھ زیادہ ہی ستا رہی تھی۔ وہ دل سے شرمندہ بھی تھی کہ زرین اس کے بارے میں کیا سوچتا ہو گا۔ اس نے باپ سے موبائل بھی مانگا، مگر شاہ زر نے جیسے اس کے ارمانوں پر اوس کے قطرے گرا دیے۔ کیونکہ وہ جب آستان اور کاشان کو لینے گیا تھا۔ تو اسی رات موبائل گھما دیا۔ کچھ دنوں تک زر مینہ بچنی نے خوب خاطر مدارت کی، ان کے ہر چیز کا خیال رکھا۔ شاہ زر کو گاؤں کی ایک معمولی فیکٹری میں کام بھی مل گیا۔ سوہا نے اپنا موبائل بہت ڈھونڈا مگر نہ ملا۔ اسے حیرت اس بات پر تھی، کہ شاہ زر کا موبائل بھی اس بے سروسامانی میں کہیں گم ہوا ہے۔ شاہ زر نے اپنے لیے نیا موبائل لے لیا تھا۔ ایک لڑکا سوہا کا ہم عمر ہو گا۔ اس کا نام ساجل تھا۔ وہ ہٹا کنٹرا سائونو جان تھا۔ اس کے نقوش اتنے اچھے نہ تھے۔ وہ سوہا سے اکثر بات چیت کرنے لگا تھا۔ سوہا بھی کزن سمجھ کر اس سے سلام کلام کر لیتی تھی۔ ساجل اسے اکثر گاؤں میں گھمانے پھرانے لگا، پھر اسے دو تین چھوٹے موٹے تھے متخالف بھی دیے، سوہا نے کزن بھائی سمجھ کر لے لیے۔ روہا بھی ان کے ساتھ ہوتی۔ مگر ایک دن اس نے سوہا سے اپنی پسندیدگی کا اظہار کر دیا۔ ساجل کے باقی چھوٹے بہن بھائی تھے۔ مگر وہ اتنے خوب نہیں تھے۔ سوہا اس کی اس بدتمیزی پر

”بیٹا.....!! کب میں نے یہ چاہا تھا۔ میں بے بس ہوں، کم لکھی انسان کو بہت کچھ کرنے پر مجبور کر دیتی ہے اور نہ چاہتے ہوئے بھی زندگی میں بدلاؤ لانا پڑتا ہے۔“

”مگر کیوں ابو.....!! کیوں کیا ہوا ہے؟ جس کی وجہ سے ہمارے ساتھ ایسا ہوا ہے۔ وہ کوئی وجہ تھی؟ جو ہم میلوں دور آگئے ہیں۔ ابو میرا دل یہاں پھٹ جائے گا۔ میرے سارے سینے ٹوٹ رہے ہیں۔“

”سوہا.....!! کچھ عرصے کی بات ہے، پھر میں تمہیں شہر لے جاؤں گا۔ آستان، کاشان کے انخوا کاروں کا یہی مطالبہ تھا کہ ہم وہ شہر چھوڑ دیں۔ ورنہ ہم ایسا نہ کرتے، تو ان دونوں کو کبھی نہیں چھوڑا جاتا۔ غربی اور امیری کا کچھ مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے تم یہ بات رہنے دو۔“ شاہ زری آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔

”ابو.....!! میں چاہتا ہوں کہ وجہ کیا تھی؟ کیوں ہم پر زبردستی کا فیصلہ مسلط کیا گیا۔ ہم کسی کا گھاتے تو نہیں ہے۔ آپ کی ادھر سرکاری جاب تھی۔ اپنا گھر تھا۔ ہم نے تو کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ اب تو شوکل میڈیا کا دور ہے۔ عدالتیں انصاف فراہم کر رہی ہیں نئی سوچ ہے۔“ سوہانے باپ کے کندھے کو ہلا ہلا کر کہا۔

”بیٹا.....!! وجہ تم تھی۔ ان لوگوں نے تمہیں بچانے کے لیے ایسا کیا۔ سندھ کا کوئی سائیں تھا۔ اس نے جب سے تمہیں دیکھا تھا، وہ بے چین ہو گیا تھا۔ تم پر عاشق ہو گیا تھا۔ وہ تمہیں انخوا کر کے زبردستی اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا تھا۔ مگر اس کے خاندان والے کوئی اسکینڈل نہیں چاہتے تھے۔ وہ بہت بااثر لوگ تھے۔ اس لیے ان لوگوں نے آستان، اور کاشان کو نشانہ بنا کر ہم سے وہ سب کروالیا۔ ہم آستان، کاشان کے لیے اتنا تو کر ہی سکتے تھے۔ میں نے وہ کیا۔ جوان لوگوں نے کہا۔ تم سب کو یہاں لے آیا۔ میں بہت بے بس تھا۔“ شاہ زری نے اپنے آنسو پونچھ لیے۔

”ابو.....!! ہم انصاف مانگتے ہیں۔ اس ملک

پس آ رہا تھا۔ سوہا اب بری طرح گھبرا رہی تھی۔ اسے واقعی لگنے لگا تھا کہ ہر لڑکا زین کی طرح شریف نہیں ہوتا۔ کچھ ساجل کے جیسے بے باک بھی ہوتے ہیں۔ جب سوہا ساجل کی دیدہ دلیری سے بہت تنگ آگئی، تو اس نے زین کو بتانے کا آخری فیصلہ کر لیا۔ مگر اس کے پاس زین کا نمبر نہیں تھا۔ مگر زین نے ایک مرتبہ اسے اپنے باپ کا نمبر دیا تھا۔ ابرار کے آفس کا کارڈ تھا۔ سوہا آتے وقت وہ کارڈ سامان میں ادھر ادھر کر بچتی تھی۔ مگر اسے اتنا یاد تھا۔ کہ وہ کارڈ اس نے اپنی کسی بک میں رکھا تھا۔ اب اسے دوبارہ سے ایک ایک چیز ڈھونڈنی تھی۔ اور اگر کوئی کسی چیز کے پیچھے پڑ جائے، تو وہ مل بھی جاتی ہے۔ سوہانے تلاش شروع کر دی۔ ہر کتاب ڈھونڈالی۔ ایک ایک صفحہ کھول کر دیکھا۔ مگر وہ کارڈ تو جیسے گم ہو گیا تھا۔ روہانے بھی اس کی بے چینی کی وجہ کی بار پوچھی۔ مگر اس نے کچھ نہ بتایا۔ وہ روہا کو کیا بتاتی، کیا سمجھاتی، وہ تو خود اس سب میں بری طرح سے الجھ کر رہ گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

سوہا اس دن بہت پریشان تھی۔ وہ ایک غمگین سی شام تھی۔ سوہا اداس سی بیٹھی ہوئی تھی۔ روہا دونوں چھوٹے بہن بھائیوں کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ شاہ زری تھکے مارے سے گھر کو لوٹ آئے تھے۔ اس نے یوں سوہا کو کمرے کے چوکھٹ میں بیٹھے دیکھا، تو اسی کے پاس آکر بیٹھ گئے۔

”سوہا بیٹا شام کو اس طرح کمرے کے آگے زین پر نہیں بیٹھتے، اس طرح شیاطین روحیں چمٹ جاتی ہیں۔“

”ابو....!! میرا اس ماحول میں دل ہی نہیں لگتا، ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے قید میں ڈال دیا ہے۔ میرا دل ہر وقت اداس رہتا ہے، کیا ہم دوبارہ کبھی شہر واپس نہیں جاسکتے ہیں۔ کیا ساری زندگی میں یہاں گزاروں گی۔ میرا یہاں دم گھٹ جائے گا۔“ سوہانے روتے ہوئے باپ کے کندھے پر سر رکھ دیا۔



کی عزتیں ہیں۔ وہ ہمیں انصاف فراہم کریں گی۔ میں شرمندہ ہوں کہ یہ سب میری وجہ سے ہوا۔ ہم کل ہی واپس جاتے ہیں۔“

”نہیں بیٹا.....!! اس ملک کا انصاف امیر آدمی کے لیے ہے، غریب کا انصاف صرف کتابوں کے صفحات پر لکھا ہوا ہے۔ جو کسی بھی عدالت میں نہیں ملتا۔ جہاں بھی ہم جائیں گے، کس کے خلاف آواز اٹھائیں گے۔ وہ کون لوگ تھے؟ جس نے آستان، کاشان کو اغوا کیا، وہ کون تھا؟ جو تم پر فریفتہ ہو گیا تھا۔ وہ کون ہے؟ جس نے ہمیں شہر بدر کیا۔ نامعلوم افراد اٹھتے کیا۔ سب ہمارا مذاق اڑائیں گے۔ یہ کوئی جادوئی معاملہ تو نہیں ہے۔ جو جادو سے حل کروائے۔ اور سوئٹ میڈیا پر صرف تماشا لگتا ہے۔ لوگ افسوس کرتے ہیں۔ مگر وہ بھی جیسے بھوک دے رہے ہوں۔ اور ہم دوبارہ شہر اپنے گھر چلے بھی جائیں۔ تو اس کی کیا گارنٹی ہوگی کہ وہ

سائیں خاموش بیٹھا ہوگا۔ اب وہ بھی ہماری چھان بین کر رہا ہوگا۔ وہ تمہیں پاگلوں کی طرح ڈھونڈ رہا ہوگا۔ یہ سائیں، وڈیرے، ایک بار جس کے پیچھے پڑ جائیں، اتنی آسانی سے اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے ہیں اور جس طرح راتوں رات ہمیں شہر بدر کر دیا گیا۔ اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ لوگ بہت با اثر تھے۔ شاہ زرنے اسے دیکھا۔ دونوں خاموش روئے لگ گئے تھے۔

”ابو.....!! میں اپنی تعلیم جاری رکھنا چاہتی ہوں، مگر میں آپ کو کوئی دکھ بھی نہیں دینا چاہتی۔ میرا دل بہت کر رہا ہے کہ میں واپس جاؤں، میں برقع پہنا کروں گی۔ ایک لمحے کو بھی کسی کو اپنا چہرہ نہیں دکھاؤں گی۔ ابو میں آپ کا بیٹا بننا چاہتی ہوں۔“ سوہانے جیسے اپنے طرف سے ایک حل پیش کیا۔

”بیٹا.....!! ابھی کچھ بھی مت کرو۔ تمہاری تجویز بہت اچھی ہے۔ مگر ابھی یہ بہت ریکی ہوگا۔ میں کوئی بھی خطرہ اٹھانا نہیں چاہتا۔ انسانوں سے ہی بھول چوک ہوتی ہے۔ خدا خواستہ اگر کل کو وہاں تمہیں کچھ بھی ہو گیا۔ تو میں جیتے جی مرجاؤں گا۔“ شاہ زرنے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”ابو.....!! میں آئندہ کبھی ایسا نہیں کہوں گی، میں انتظار کروں گی، مگر میں اس گاؤں میں زندگی نہیں گزار سکتی۔ میں آپ سب کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتی ہوں۔“ شاہ زرن کی باتیں سن کر سوہا کو دن میں تارے نظر آ گئے تھے۔ وہ کبھی اس بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ اس سب کی ذمہ دار ہوگی۔ سب کچھ اس کی وجہ سے ہوا ہے۔ وہ چپ ہو گئی۔

”سوہا بیٹا.....!! میں نے کبھی ایسا سوچا تک نہ تھا۔ اور نہ چاہا تھا کہ ہم دوبارہ اس پسماندہ گاؤں میں واپس آجائیں، وہاں کم از کم میں تم لوگوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ تو کر رہا تھا۔ یہاں آکے تو وہ بھی تم سب سے چھین گیا ہے۔“

”ابو.....!! آئندہ میں ایسی کوئی بات نہیں کروں گی، جس سے آپ کو دکھ ملے۔“ سوہانے باپ کو اٹھایا۔ اب وہ اسے کمرے میں لے جا رہی تھی۔

”نہیں تم نے بھی مجھے کوئی دکھ نہیں دیا ہے، یہ تو ہماری قسمت کا لکھا تھا جو پورا ہوا۔“ سوہانے اندر کچھ ٹوٹ سا گیا۔

”سوہا بیٹا.....!! اگر تمہارے پاس یونی والوں کا کوئی بھی نمبر ہو، تو اس سے ہرگز رابطہ نہیں رکھنا۔ کیا پتہ کہیں وہی تمہارے لیے مصیبت کا سبب بن جائیں۔“ باپ کی بات پر سوہا کا دل کرچی کرچی ہو گیا، مگر اس نے کچھ نہ کہا۔

دن بردن گزرنے لگے۔ مگر اس نے اب باپ سے کچھ بحث نہیں کرنی تھی۔ اس نے اپنے آنسو پوچھ ڈالے، مگر وہ زین کو کہیں بھول سکتی تھی۔ اس کا دل رو رہا تھا کہ زین اور ساری یونی والے اس کے بارے میں کیا سوچیں گے۔ مگر اس کو سب سے زیادہ زین کی پرواہ تھی۔ اس سے وہ رابطہ کر سکتی تھی۔ اس نے پہلے سے زیادہ شدت کے ساتھ زین کے باپ کا نمبر ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ مگر ہرگز تادان مایوسی دکھا رہا تھا۔ اور ایسے ہی تلاش بسیار مزید میں کئی دن بے نتیجہ بن کر گزر گئے۔

کہا۔

”نہیں.....!! پر تو صرف پریوں کے پاس ہوتے ہیں۔ ہم اگر پر لگوا بھی دیں، تو بھی ہم نہیں اڑ سکتے۔“

”کیوں نہیں اڑ سکتے، پرندوں کے پاس بھی پر ہوتے ہیں، تو وہ بھی تو اڑتے ہیں۔“ زرش نے منہ بسور کر کہا۔

”ارے.....!! پر کہاں ملتے ہیں؟ میرا خود دل کرتا ہے کہ میں پر لگوا کر اڑ کر یہاں سے دور کہیں چلی جاؤں۔“ سوہانے زرش کو گلے لگا کر کہا۔

”مون.....!! ہم کبھی نہیں چاہیں گے، کہ آپ ہمیں چھوڑ کر چلی جائیں۔“ روحان نے خشکی سے کہا۔

”کیوں؟“ سوہانے زرش کو بٹھایا۔ اور روحان سے پوچھا۔

”اس لیے کہ آپ اگر اپنے شہزادے کے پاس چلی گئیں، تو ہمیں مافی پریوں، اور شہزادیوں کی کہانیاں سنانے کا۔“ احد نے کیوں کا جواب دیا۔

”تم لوگ دعا کرو کہ میں اپنے شہزادے سے مل لوں۔ سنا ہے کہ بچوں کی دعائیں ضرور قبول ہوتی ہیں۔ اور جب میں یہاں سے چلی جاؤں گی، تو اپنے شہزادے کے ساتھ تم لوگوں سے ملنے آیا کروں گی۔“ سوہانے آخر میں ہنس کر بتایا۔ اس کے گال کا ڈھیل بہت پیارا لگ رہا تھا۔

”مون سچی میں۔“.....!! سب بچے ایک ساتھ بول پڑیں۔

”ہاں سچ میں آئی پر امیں۔“.....!! سوہا مسکرائی۔

”ہم ضرور دعا کرینگے۔ پھر آپ کا شہزادہ بھی ہمیں کوئی کہانی سنانے گا ناں۔“

”ہاں بالکل.....!! اگر اس نے نہ سنایا، تو میں اسے پھر سے چھوڑ دوں گی۔“ سوہانے نمر کو قریب کر کے کہا۔

”اچھا.....!! مون ہم اب چلتے ہیں۔ مگر کل

سوہانے گاؤں کے بچوں کو پڑھانا شروع کر دیا، اسے کچھ تو کرنا تھا۔ یہی اسے سب سے بہترین عمل لگا۔ وہ اس کی مدد کر دیا کرتی تھی، یہاں سے کالج کافی دور تھے۔ یونیورسٹی تو شہر میں تھی۔ جو کتابیں سوہا کے پاس تھیں، اس نے وہ بچوں کو دے دی۔ اب اس کو سرٹھکھانے کو فرصت تک نہیں ملتی تھی۔ آستان، کاشان اور زوہا کو قریبی اسکولوں میں داخل کر دیا گیا۔ تقدیر کی قسم ظریفی سمجھ کر سوہانے جیسے صبر کر لیا تھا۔ اس کو نہ تو اپنا موبائل ملا، اور نہ وہ کارڈ جس سے ابراہار سے رابطہ ہو سکتا تھا۔ بچے بھی سوہا سے پیار کرنے لگ گئے تھے۔ وہ بھاگ بھاگ کر اس کے کام کرتے تھے۔ اس کے لیے روز نئے تھے تھے تحائف لاتے تھے۔ کبھی کھار پھول اور چاکلیٹ لے کر آ جاتے تھے، سوہا ان کو کبھی کھار کوئی کہانی بھی سنایا کرتی تھی۔ وہ بڑے ادب سے کہانی سنتے تھے۔ آج بھی بہت سارے بچے سوہا کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ چھوٹے پریشانی ہوئی تھی۔ اور آرام سے چھول رہی تھی۔ اور ساتھ ساتھ بچوں کو کہانی بھی سنارہی تھی۔

”ایک پری تھی، جو بہت پیاری تھی۔ وہ دور پرستان میں رہتی تھی۔ جب بھی پورے چاند کی رات ہوتی، وہ پرستان سے اڑ کر یہاں آ جاتی اور پھر وہ چاند کو دیکھا کرتی۔ اسے چاند میں شہزادے کا عکس نظر آتا تھا۔۔۔۔!! وہ ساتھ ساتھ کہانی سناتی، بچے تجسس سے سنتے رہتے اور جب کہانی ختم ہو جاتی۔ تو سارے بچے سوہا کے ارد گرد جمع ہو کر کہتے۔ سب بچے اسے مون کہتے تھے۔“

”مون.....!! وہ پری آپ جتنی حسین نہیں ہوتی ہوگی۔“ سوہا ان کی بات سن کر ہنسنے لگی۔

”نہیں۔۔۔!! پریاں واقعی حسین ہوتی ہیں۔“

وہ تو اڑتی بھی ہیں۔“ سوہانے ایک چھوٹے سے بچے کا ناک پکڑ کر کہا۔ سب بچے حیرانی سے سوہا کو دیکھنے لگے۔

”مون.....!! اگر ہم آپ کو پر لگوا دیں، تو کیا آپ بھی اڑنے لگوں گی۔“ ایک بہت پیاری سی بچی نے

سبق کے بعد آپ ہمیں وہ کہانی دو بارہ سنائیں گی۔ جس میں ایک خوبصورت لڑکی ہوتی ہے۔ جو ایک بہت خوبصورت لڑکے سے پیار کرتی ہے، مگر پھر ان دونوں کے درمیان ایک شیطان آجاتا ہے۔ اور دونوں جدا ہو جاتے ہیں۔ اور وہ لڑکی آگ کے دائرے میں قید ہو جاتی ہے۔“۔ احمر نے آنکھیں کھول بند کر کے پٹک پٹک کر کہا۔

”ہاں.....!! مون.....!!! احربا کل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ وہ ہماری من پسند کہانی ہے۔“ کچھ بچے ایک ساتھ کورس میں بول پڑے۔

”بچو.....!! جب تم لوگوں نے وہ کہانی سن رکھی ہے۔ تو دوبارہ سن کر کیا کرو گے؟“ سوہانے سب کو گھورا۔

”مومن.....!! بس وہ ہماری فیوریٹ کہانی ہے۔ ہمیں وہ سن کر اچھی لگتی ہے۔“ آنیہ نے کھڑے ہو کر کہا۔

”اچھا.....!! بیٹا میں کل سنا دوں گی“ سوہا نے آنیہ سے کہا۔

”یا ہو.....! امون زندہ باد۔۔۔!!“ سب  
 بچے اٹھ کر جوش سے بولے۔ ”اب وہ سارے لائن  
 میں گھر سے نکل رہے تھے۔ سوہانے جھولے پر جھولنا  
 بند کر دیا۔ وہ بچوں کو دیکھ رہی تھی۔ وہ جھولے سے اٹھ  
 کر اندر کمرے میں چلی گئی۔ وہ بچوں کی باتوں پر ہنس  
 رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

سوہا آگن میں کھڑی تھی، وہ دروازے کو دیکھ رہی تھی، اس کو گھر کے چوکھٹ میں زمین کا چہرہ نظر آیا، وہ سوالیہ انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اندر کمرے میں چلی گئی، اس نے وہ کارڈ دوبارہ سے ڈھونڈنے کا فیصلہ کر لیا۔ اسے وہ کارڈ ڈھونڈنا تھا۔ جس پر زین کے باپ کا نمبر لکھا تھا۔ وہی اس کا آخری امید تھا۔ دوبارہ سے اس نے اپنے کورس کی کتابیں نکالیں، اور اس کے صفحات الٹ الٹنے لگی۔ مگر وہ کارڈ جیسے کہیں گم ہو

گیا۔ اچانک اس کی نظر زوہا کے اسکول کے پرانے بیگ پر پڑی۔ سوہانے لپک کر اسے اتارا۔ اب وہ بیگ سے ساری چیزیں نکال رہی تھی۔ ایک کالی جلد والی ڈائری تھی۔ جسے سوہانے نکال دیا اس نے جیسے ہی وہ کھولی۔ پہلے صفحے پر وہی کارڈ پڑا ہوا تھا۔ سوہانے خوشی سے وہ اٹھایا۔ وہ جیسے خود کو ہواؤں میں اُڑتا محسوس کرنے لگی تھی۔ اسے لگا کہ جیسے اسے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔

”ابراہیم احمد کارپوریٹ سیشن“.....!!! سوہانے  
کارڈ کے اوپر دیکھا۔ اسے پتہ تھا زین کے ڈیڈ کا نام  
ہے۔ اور یہ اس کا کارڈ ہے۔ شاہ زرگھر سے باہر تھا۔  
ورنہ سوہا اس سے موبائل مانگ کر ابراہیم کو بھی کال کر دیتی  
ہے۔ اور اس سے زین کا نمبر مانگ لیتی۔

”یا ہو“.....!! سوہانے ہوا میں ہاتھ لہرایا۔ وہ  
 ہنسی اس نے کارڈ اسی ڈائری میں رکھا، اور ڈائری بیک  
 میں رکھ دی۔ وہ خوش تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس کا  
 مسئلہ حل ہو چکا ہے۔ اب وہ زین سے دوبارہ مل لے  
 گی۔ اس کی زندگی دوبارہ اسی روٹین پر آجائے گی۔

اچانک گھر کے اندر ایک بچہ آ گیا۔ اور سیدھا  
 سوہا کے سامنے رک گیا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر  
 سوہا کی طرف سرخ گلاب کے پھول بڑھا دیے۔ اس  
 کے ساتھ ایک چھوٹا سا کاغذ بھی تھا۔ جو گلاب کے  
 پھولوں کے اندر تہہ کر کے رکھا ہوا تھا۔ اس بچے کو سوہا  
 جانتی تھی۔ اس نے وہ پھول لے لیے۔ بچہ بھاگ کر گھر  
 سے نکلتا چلا گیا۔

”ارے مٹا....!! رک، سن تو۔۔۔“ سوہانے  
منے کو روکنا چاہا۔ مگر وہ ہوا کے گھوڑے پر سوار تھا۔ فوراً  
پہلا گیا۔ سوہانے غور سے پھولوں کو دیکھا۔ وہ دروازہ  
تھے۔ اس نے وہ ناک کے قریب لاکر سونگھ لیے۔ اس کو  
پھولوں کی خوشبو بہت اچھی لگتی تھی۔ اچانک اس کی  
نظریں پھولوں کے اندر رکھے کاغذ پر پانک گئی۔ اس نے  
تھ بڑھا کر کاغذ نکال لیا۔ وہ تہہ در تہہ تھا۔ سوہانے  
کانتے ہاتھوں سے کاغذ کھول لیا۔

”جان سے پیاری“.....!! پہلی سطر پر نظر پڑتے، بی سارے پھول اس کے ہاتھوں سے گر گئے۔ اس کو شدید غصہ آ رہا تھا۔ وہ love letter تھا۔ جو ساجل نے لکھا تھا۔ سوہانے سارے پھول اٹھا کر باہر پھینک دیے۔ اور خط کو بڑھے بغیر پرزہ پرزہ کر کے دیوار کے پار پھینک دیا۔ وہ غصے سے گھر میں ادھر سے ادھر ٹہلنے لگی۔

☆.....☆.....☆

محبت کی کہانی میں میرے سارے خواب جل گئے کوئی تعبیر ملی نہیں میرے سارے گلاب جل گئے زین نے بونی میں شاندار گریڈ لیا تھا۔ وہ اے پلس ون تھا۔ اس کی جی پی اے بہت زبردست آئی تھی۔ مگر اس کے باوجود بھی وہ راسا بھی خوش نہیں تھا۔ کیونکہ اس کی زندگی بالکل پھینکی سی پڑ گئی تھی۔ ابرار نے بھی یہ بات محسوس کی کہ زین کی تبدیلی کے پیچھے سوہا ہی ہے۔ اس نے زین کی ڈگری لینے کی خوشی میں بہت بڑی پیارنی رینج کی مگر زین اس کو دل سے سلبریت تک نہ گھر سکا۔ وہ بے دلی سے سب سے ملتا رہا۔ اس دن گھر میں جیسے جشن کا سماں تھا۔ اس میں اعوان فیملی بھی انوائٹ تھی۔ ماہ نور جنین نے مسز ابرار کے ساتھ بہت اچھا وقت گزارا تھا۔ فوٹو سیشن سے لے کر ہر چیز میں ماہ نور ان کے آگے پیچھے پھرتی رہی تھی۔ پورے گھر کو برقی قہقہوں سے سجایا سنوارا گیا تھا۔ زین کو جگہ جگہ سوہا کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ مگر وہ جب بھی سوہا کے جانب قدم اٹھاتا وہ گم ہو جاتی۔ اس کا روشن چہرہ تاریک پڑ جاتا۔ بڑے بڑے خاندانوں کے لوگ آ رہے تھے۔ رینج بہت پیارا ڈیزائن کیا گیا تھا۔ زین نے شائینگ تھری پیس زیب تن کر رکھا تھا۔ ماہ نور جنین اس کے قریب کسی مووی تجسس کی طرح کھڑی تھی۔ وہ دونوں اچھے لگ رہے تھے۔ مگر زین نے اس کی طرف ایک بار بھی غور سے دیکھا تک نہیں تھا۔ زین بہت خوبصورت لگ رہا تھا، جیسے وہ کسی سلطنت کا شہزادہ ہو۔ مگر وہ اندر سے بے حد بے چین تھا۔ وہ جلد از جلد اس تقریب کا خاتمہ چاہتا تھا۔ اس کو

”میں اس ساجل کو چھوڑوں گی نہیں، اس کا ہمت کیسے ہوئی اس طرح گھٹیا حرکت کرنے کی۔“ وہ دل ہی دل میں بری طرح سے تاؤ کھانے لگی۔

بچہ ساجل سے باہر مل رہا تھا۔ اس نے ساجل سے چاکلیٹ لے لیے۔ اور اسے بتایا: ”مون.....!!“ آپ کو تھینک یو کہہ رہی تھی۔“ ساجل خوشی سے جیسے سرشار ہو گیا۔ اس نے بچے کو اٹھا کر چوم لیا۔ اور ہوا میں اڑا کر پکڑ لیا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا، اب وہ بچے کو ہاتھوں سے پکڑ کر دائرے میں گھما رہا تھا۔ اب وہ گھر جا رہا تھا۔ اگر وہ مڑ کر دیکھ لیتا، تو اس کو سوہا کا جواب مل جاتا۔ اس کے پیچھے گئے پھول گھر کی دیوار سے باہر پڑے ہوئے تھے۔ اور اب اس کا خط بھی ٹکڑوں کی صورت میں گھر سے باہر پھینک دیا گیا تھا۔ اندر کمرے میں سوہا جیسے انگاروں پر ٹپکس رہی تھی۔ اس کو رہ کر ساجل کی اس حرکت پر غصہ آ رہا تھا۔

”میں اس گاؤں میں نہیں رہ سکتی۔ اوپر سے ساجل مجھ سے شادی کر کے مجھے ہمیشہ کے لیے یہاں بسانا چاہتا ہے۔“ پتہ نہیں اس ساجل نے میری کون سی ایسی حرکت سے محسوس کیا کہ میں اس سے پیار کرتی ہوں۔“ اچانک وہاں روہا آ گئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ سوہا کے کندھے پر رکھے ہوئے تھے۔

”یار.....!! کتنا پیارا موسم ہے۔ کیوں نہ ہم ساجل کو بلا کر گاؤں کی سیر کے لیے باہر چلے جائیں۔“ وہاں نے اس کو کہا۔

”خبردار.....!! جو تم نے ایسا کچھ بھی کیا۔ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔“ سوہانے اس کے ہاتھ اپنے

”بیٹا! وہ مجھے پسند ہی نہیں ہے، سو میں کیسے ایک ناپسندیدہ سستی کو اپنی زندگی میں خود پر لاگو کر سکتا ہوں۔“

”میرے پاس یہ سستی کو اپنی زندگی میں خود پر لاگو کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے، میں میری زندگی ہے، میں خود اپنی مرضی سے اپنی پسند سے کسی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

”میرے پاس یہ سستی کو اپنی زندگی میں خود پر لاگو کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے، میں میری زندگی ہے، میں خود اپنی مرضی سے اپنی پسند سے کسی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

”میرے پاس یہ سستی کو اپنی زندگی میں خود پر لاگو کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے، میں میری زندگی ہے، میں خود اپنی مرضی سے اپنی پسند سے کسی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

”میرے پاس یہ سستی کو اپنی زندگی میں خود پر لاگو کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے، میں میری زندگی ہے، میں خود اپنی مرضی سے اپنی پسند سے کسی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

”میرے پاس یہ سستی کو اپنی زندگی میں خود پر لاگو کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے، میں میری زندگی ہے، میں خود اپنی مرضی سے اپنی پسند سے کسی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

”میرے پاس یہ سستی کو اپنی زندگی میں خود پر لاگو کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے، میں میری زندگی ہے، میں خود اپنی مرضی سے اپنی پسند سے کسی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

”میرے پاس یہ سستی کو اپنی زندگی میں خود پر لاگو کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے، میں میری زندگی ہے، میں خود اپنی مرضی سے اپنی پسند سے کسی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

”میرے پاس یہ سستی کو اپنی زندگی میں خود پر لاگو کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے، میں میری زندگی ہے، میں خود اپنی مرضی سے اپنی پسند سے کسی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

”میرے پاس یہ سستی کو اپنی زندگی میں خود پر لاگو کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے، میں میری زندگی ہے، میں خود اپنی مرضی سے اپنی پسند سے کسی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

”میرے پاس یہ سستی کو اپنی زندگی میں خود پر لاگو کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے، میں میری زندگی ہے، میں خود اپنی مرضی سے اپنی پسند سے کسی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”آپ نے میرے چہرے سے اندازہ نہیں لگایا۔“ زرتاشہ نے بنا دیکھے اس سے کہا۔

”اگر چہروں سے اندازے لگائے جاسکتے، تو میں بنا پوچھے زین سے یہ رشتہ اب تک طے کر چکا ہوتا۔ میں اس کی زبانی سننا چاہتا تھا۔“ ابرار نے اس کا چہرہ اپنی طرف گھمایا۔ زرتاشہ کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔

”صاف انکار.....!! اسے ماہ نور ذرا بھی پسند نہیں ہے۔ وہ اسے پلاسٹک کی بنی لگتی ہے۔ اس کے خیالات اس کے بارے میں اچھے نہیں ہیں۔“ زرتاشہ نے آنسو پونچھ لیے۔

”تو تم اس کی پسند پوچھ لیتی ناں.....!!“ ابرار نے قہر سے کہا۔ اسے زین پر شدید غصہ آ رہا تھا۔

”کیا پوچھتی میں، جو ہمارا حق تھا، وہ تو دیا ہی نہیں۔ وہ سر پھرا کہہ رہا تھا، خود اپنی مرضی سے، اپنی پسند سے زندگی کا ہم ترین فیصلہ کرنا چاہے گا۔“ زرتاشہ دل کی بھڑاس نکالنے لگی۔

”اوہ.....!! تو صاحب زادے کے دماغ میں ابھی بھی عشق کا خناس موجود ہے۔ اس کے دل سے وہ منخوس لڑکی نکلی نہیں ہے۔“ ابرار دل ہی دل میں گویا ہوئے۔ وہ ایسے بیٹھے تھے جیسے کچھ سوچ رہے تھے۔

”زر.....!! تم آرام کرو، دل پر مت لو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ خیر میں بے حد تھک چکا ہوں۔ اب آرام کروں گا۔“ ابرار نے زرتاشہ سے کہا۔ وہ اٹھے اور پلنگ پر لیٹ گئے، زرتاشہ چہنچہن کرنے کے لیے دوش روم میں کھس گئی۔ وہ کچھ دیر بعد نکلی تو نائیتی میں لمبوس تھی۔ اس نے ابرار کو دیکھا۔ وہ لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر وہ اداس سا لگ رہا تھا۔ زرتاشہ بھی سارے خیالات جھٹک کر آرام سے لیٹ گئی۔

☆.....☆.....☆

ابرار نے ہر طرف سے کامیاب چالیں چلی تھیں۔ اس کے دونوں کرائے کے بندوں نے سواہ اور

میں سے ایک کی زندگی تباہ ہو۔ وہ فیشن کوئن ہے۔ مجھے فیشن بالکل بھی عورتوں کے ساتھ اچھا نہیں لگتا۔“ زین نے نام کو صاف الفاظ میں صاف بتا دیا۔

”زین.....!! بس وہ ہمیں پسند ہے، تمہارے ڈیڈ کی شدید خواہش ہے۔۔۔۔۔!!“

”مام.....!! زندگی میں نے بتائی ہے، مجھے فورس نہ کریں، آپ ڈیڈ کو سمجھا دیجیے گا۔ میں ان کی خواہش پر اپنی پسند سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔ میں قطعاً ماہ نور کے لیے ایگری کی نہیں ہوں۔“ زین نے مام سے کہا۔ زرتاشہ کی آنکھوں میں دکھ تھا۔ مگر اس نے اپنی آنکھوں میں آئے آنسو چھپا لیے۔ وہ ماں تھی، اپنا ماں نہیں توڑنا چاہتی تھی۔

”او کے، جیسے تمہاری مرضی، میرا کام تمہیں سمجھانا تھا، سمجھا لیا۔ اب تم نے جیسے مجھے سمجھایا، بالکل اسی طرح اپنے ڈیڈ کو بھی سمجھا دینا گا۔“ زرتاشہ مزید رکی نہیں، وہاں سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ زین کی صاف گوئی نے زرتاشہ کی آنکھوں میں مرجھی جی بھری تھی۔ اسے اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ زین کی رنجش اس کی سمجھ سے باہر تھی۔ ماہ نور وہ لڑکی تھی، جو دولت نام رتبہ نسب سب رکھتی تھی۔

”ہاں ڈیڈ کو بھی سمجھا دوں گا۔ میں کوئی دودھ پیتا بچہ تو ہوں نہیں، جو آپ کہیں اور وہ کرتا چلا جاؤں گا۔“ میں اپنے فیصلے خود کر سکتا ہوں۔ اب میں بڑا ہو چکا ہوں۔“ زین خود سے کہنے لگا۔ وہ بے چینی سے یہاں سے دیاں پھر رہا تھا۔ اس کو مام کی باتیں سمجھ ہی نہیں آ رہی تھیں۔

☆.....☆.....☆

زرتاشہ کمرے میں پہنچ کر پلنگ پر بے سدھ سی بیٹھ گئی۔ ابرار دوش روم سے نکلے، انہوں نے نائیتی پہن رکھی تھی۔ انہوں نے زرتاشہ کو دیکھا۔ اس کا تاریک چہرہ ان کی سمجھ سے باہر تھا۔ وہ بھی اس کے قریب پلنگ پر بیٹھ گئے۔

”برخوردار نے کیا جواب دیا؟“ ابرار نے اس

سوبا کو گم ہوئے کئی مہینے بیت چکے تھے۔ سوبا کی یاد زین کے دل میں ابھی بھی اول روز کی طرح تروتازہ تھی۔ وہ اسے کبھی نہیں بھلا سکتا تھا۔ سوبا کی یاد کا دیا ابھی تک زین کے دل میں روشن تھا۔ وہ اسے کبھی بھلا نہیں سکتا تھا۔ اس لیے تو اس نے ایکٹنگ شروع کر دی تھی۔ اس کا کیریئر کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ بہت بڑا اشار بن گیا تھا۔ کیونکہ وہ امیر تھا، خوش شکل، وجہہ تھا۔ اسے بہت جلد ہر طرف سے دیکھ کر خاموش ہو گئے۔ ان کے سارے اختلافات ختم ہو گئے۔ زین اور ابرار کے معمولات ٹھیک چل رہے تھے۔ زین تازہ بھی خوش تھی۔ مگر وہ ماہ نور جبین تھی، جو زین کو چاہتی تھی۔ اور اس کے ماں باپ زین کی شادی ماہ نور سے کرنا چاہتے تھے۔ مگر زین ایسا کچھ نہیں چاہتا تھا۔

☆.....☆.....☆

ابرار کو یقین ہو چکا تھا کہ دوبارہ سوبا کا نام زین کی زندگی میں کبھی نہیں آئے گا۔ زین آفس میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے آج بہت مصروف دن گزارا تھا۔ ابرار کو یقین ہو چکا تھا کہ سوبا دوبارہ کبھی زین کا نام زبان سے ادا نہیں کر پائے گی، ابرار سوبا کو مارنا نہیں چاہتا تھا، مگر مردوں جیسی زندگی گزارنے پر مجبور کرنا چاہ رہا تھا۔ مگر وہ اس کی عزت بھی خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سانول، اور نوری نے اپنی مرضی کا کام کیا۔ ابرار نے آگے کچھ بھی نہ کہا۔ وہ سمجھا کہ کام کیا ہے تو پکا ہی کیا ہے۔ سانول اور نوری نے گارنٹی دے دی تھی، کہ دوبارہ کبھی یہ معاملہ اس کی زندگی میں نہ آئے گا۔ اس نے ان کو شہر بدر کر دیا تھا۔ ابرار نے بھی یقین کر لیا تھا۔ ابرار اتنے مہینے گزرنے کے بعد سوبا کا نام جیسے بھلا بیٹھا تھا۔ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا، کہ زین ابھی بھی سوبا سے محبت کر رہا ہے، اور اسے بھلا نہیں پایا ہے۔

ماہ نور جبین ابرار احمد کے لیے سیاست میں کامیابی کی ضمانت تھی، وہ اب ماہ نور جبین کو زین کے قریب لانے کے طریقے سوچ رہا تھا۔ مگر اس کی سمجھ میں

اس کے گھر والوں کا پتہ صاف کر دیا تھا، پچھلے کئی مہینوں سے نہ صرف اس کا گھر بند تھا۔ بلکہ ان لوگوں کا کچھ اتہ پتہ نہیں تھا۔ ابرار نے نوری اور سانول کو اس کام کا بہت بڑا معاوضہ دیا تھا۔ ابرار کو اب اطمینان ہو چکا تھا کہ سوبا نام کا بھوت زین کی زندگی سے نکل چکا ہے۔ وہ دوبارہ کبھی بھی زین کی زندگی میں شامل نہیں ہو سکتا ہے۔ زین نے اپنی تعلیم مکمل کر دی تھی۔ ابرار کو لگتا تھا کہ زین سوبا کو بھول چکا ہوگا۔ مگر ماہ نور جبین کے لیے انکار کر کے، زین نے جیسے ابرار کے زخموں پر نمک چھڑکا تھا۔ زین تعلیم مکمل ہونے پر بہت خوش تھا۔ ابرار چاہتے تھے کہ زین اب برنس میں دل لگائے، مگر زین پر تو جیسے کوئی دوسرا بھوت سوار ہو گیا تھا۔ وہ برنس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ تو ایکٹنگ کرنا چاہتا تھا۔ وہ ڈرامہ ایکٹر بننا چاہتا تھا۔ ابرار کبھی نہیں چاہتے تھے کہ زین برنس کے علاوہ کسی دوسرے فضولیات میں اپنا وقت ضائع کرے۔ زین

نے ابرار کی بھرپور مخالفت کی، اور الحرام میں ایکشن لے لیا۔ وہ اب گھر بھی بہت کم آتا تھا۔ اس نے اصرار میں ایکٹنگ سیکھنی اسٹارٹ کر دی۔ ابرار اس سے ناراض ہو گئے۔ مگر زین نے ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ ابرار نے زین سے بات کرنا کم کر دیا۔ مگر زین اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزارنے کا خواہاں تھا اور وہ کسی ڈائریکٹر کی نظروں میں آ گیا۔ اس کو پہلا پراجیکٹ مل گیا۔ وہ بہت اچھا لیا گیا۔ پھر اسے کام ملتا چلا گیا۔ زین کو ایکٹنگ میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ مگر ایک دن سوبانے اس سے کہا تھا۔ ”زین تم ایکٹر بن جانا، میں سنگر بن جاؤں گی۔ ہماری دوستی بہت مضبوط ہو جائے گی۔“ اب سوبا تو نہیں تھی، زین تو تھا، زین نے سوبا کی بات ماننے کا فیصلہ کر لیا۔ زین نے سوبا کو ڈھونڈنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے سوبا کو ڈھونڈنے کے لیے ایکٹنگ کا سہارا لینا چاہا۔ زین کا ذاتی خیال تھا کہ سوبا اسے کبھی نہ کبھی ٹی، وی، اسکرین پر ضرور دیکھے گی اور ہو سکتا ہے کہ وہ اسے ٹی، وی پر دیکھ کر اس سے دوبارہ رابطہ کر لے۔ اس لیے وہ بہت زیادہ مشہور ہونا چاہتا تھا۔

ہوا ہے۔ بس اس گاؤں کے ماحول سے کچھ اکتا گئے ہیں۔“ سوہانے روہا کو دیکھا۔  
 ”ہاں.....!!! یہ گاؤں ہے، یہاں کا ماحول چیخ ہے۔ تم لوگوں کو اب صبر کرنا پڑے گا۔“ باپ نے سوہا سے کہا۔

”ابو.....!! کیا ہم دوبارہ اپنے گھر نہیں جاسکیں گے؟“ روہا کے دل کا سوال لبوں پر آیا۔ یہ سوال پہلے سوہا بھی باپ سے کر چکی تھی۔

”کیوں نہیں ہم اپنے گھر ضرور جائیگے، اس میں کچھ وقت لگے گا۔“ شاہ زر پیار سے روہا کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولے۔

”ابو.....!! میرا دل یہاں بالکل بھی نہیں لگ رہا ہے۔ دل کہہ رہا ہے، اس منحوس گاؤں سے اڑ کر چلی جاؤں۔ یہاں تو بجلی کی سہولت بھی ناکافی ہے۔ سارے دن میں دو گھنٹے بجلی ہوتی ہے۔“ روہانے باپ کو دیکھا۔ اس کو بھی مسکے کا ٹھیکہ ہے پتہ نہیں تھا۔ مگر وہ یہاں بالکل بھی خوش نہیں تھی۔ شاہ زر نے بے بسی سے سوہا کو دیکھا وہ پیچھے دیکھ رہی تھی۔

”سوہا بیٹا.....!! میں خود نہیں چاہتا کہ تم لوگ یہاں رہو۔ مگر بھی مجبوری میں وہ سب کرنا پڑتا ہے۔ جو ہم نہیں چاہتے ہیں۔“

”جی ابو.....!!! میں سمجھ سکتی ہوں۔ زندگی کبھی کبھار ایک لمحے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اور یہ ایک لمحہ ہمارے زندگی میں آکر گزر چکا ہے۔“ سوہانے باپ کی طرف دیکھا۔ اس کو شاہ زر سے اب کوئی بھی شکوہ نہیں تھا۔

”ابو.....!! یہاں تو کوئی قریبی پارک بھی نہیں ہے، جس میں ہم دل بہلانے کے لیے جاسکیں۔ مجھے یہاں زندگی جمود کا شکار لگ رہی ہے۔ یا پھر اس جھیل کی طرح ہے۔ جس کا پانی رکا ہوا ہو، اور اس کے پانی کے اوپر کائی جم چکی ہو، جس میں کوئی پتھر بھی بھینکا پسند نہیں کرتا۔“ روہا کچھ زیادہ ہی خفا تھی۔ وہ اس گاؤں سے کسی طرح جانا چاہ رہی تھی۔ شاہ زر نے روہا کو دیکھا۔

کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔ وہ سوچ سوچ کر پریشان ہو چکا تھا۔ ماہ نور جنین اس کے لیے بلیک چیک تھی۔ وہ ملک کا نامی گرامی سیاست کار کن بن سکتا تھا۔ اچانک اس کے آفس کی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے بے اختیار فون کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ یہ نمبر بہت کم لوگوں کے پاس تھا۔

☆.....☆.....☆

گاؤں میں سیٹ ہونے کے بعد شاہ زر کچھ مطمئن ہو گئے تھے۔ آج جیسے ہی وہ فیملی سے واپس آئے سوہانے ان کا تھیلہ لے لیا اور اسے چار پائی پر بٹھا دیا۔ یہ لوگ تو جیسے دنیا سے ہی کٹ کر رہ گئے تھے۔ ان کے گھر ٹی، دی تھا۔ مگر کیبل نہیں لگا تھا اور ٹی، دی پر بہ شکل ایک ادھ جینل نظر آتا تھا۔ وہ جینل بھی یہ لوگ کم ہی دیکھا کرتے تھے۔ شاہ زر چار پائی پر بیٹھ گیا۔ سوہا اس کے لیے پانی لے آئی۔ روہا بھی باورچی خانے سے ٹرے نکال کر لے آئی۔ دونوں اس کے ساتھ چار پائی میں بیٹھ گئی۔ اب وہ کھانا کھا رہے تھے۔ آستان اور کاشان نے کھا لیا تھا۔ روہا سو بجلی تھی۔ دن بھر مصروفیات پر بات چیت ہونے لگی۔ آستان، کاشان گاؤں کے واحد اسکول میں داخل کرا دیے گئے تھے۔ روہا گرلز اسکول جانے لگی تھی۔ یہاں قریب کوئی کالج نہیں تھا۔ اس لیے روہا گھر پر ہی ہوتی تھی۔ سوہا بھی سارا دن گھر میں ہی ہوتی تھی۔ اس گاؤں میں کوئی یونیورسٹی نہیں تھی۔ شاہ زر نے ان کے سرٹیفکیٹ بھی نہیں نکلوائے تھے۔ اور یہاں سے شہر بہت دور تھا۔ سو ان دونوں نے گھر میں رہنے کو ہی بہتری جانی۔

”ابو جی.....!!! آج کا دن کیسے گزرا؟“ سوہا نے کھانے کے بعد باپ سے پوچھا۔

”بس گزر گیا۔ تم لوگوں کا کیسے گزرا؟ کوئی بات تو نہیں ہوئی؟“ روہا بھی ان کے ساتھ قریب بیٹھ گئی۔ وہ شہری ماحول کی پروردہ تھی تو گاؤں میں اس کا دل خام ہی لگتا تھا۔

”نہیں ہمارا تو جیسے روز ہی گزرتا ہے۔ کچھ نہیں



لیے۔ سوہا اسے دیکھ کر رہ گئی۔ وہ اسے کچھ دیر دیکھتی رہی پھر اس نے چھٹ کر اس سے موبائل لے لیا۔  
 ”بدتمیزی یہ ہوتی ہے۔ مجھے موبائل چاہیے، اور کسی کو بہت ضروری کال کرنی ہے۔“ سوہانے موبائل اس سے لے کر مزے سے اسے دیکھا۔

”یار.....!! میں تمہیں معاف نہیں کروں گی، تم نے میرا سارا گیم خراب کر دیا ہے، میں جیتنے والی تھی۔ اب میں کیسے دوبارہ یہاں تک لاؤں گی۔ اتنا مشکل لیول ہے۔“ روہا کو موڈ سخت آف ہو گیا تھا۔ اسے اپنی گیم کی فکر تھی۔ سوہا کو اس کی کچھ پرواہ نہ تھی۔  
 ”گیم.....!! موبائل میں نہیں ریل لائف میں جیتا جاتا ہے۔“ سوہانے اسے گھور کر دیکھا۔

”اچھی بھلی جھولا جھول رہی تھی واپس جا رہی ہوں۔“ روہا پیرنچ کر وہاں سے چلی گئی۔ سوہا بھی ہنس دی۔ سوہانے ابراہن کا کارڈ نکالا، اور اس کے آفس کا نمبر ری ڈائل کیا۔ نمبر ڈائل کرنے کے بعد اس نے موبائل کان سے گالیاں لگے چل اس نے موبائل غیر یقینی سے آنکھوں کے سامنے کر دیا۔

”اس کال کے لیے آپ کی رقم ناکافی ہے۔ برائے مہربانی اپنا اکاؤنٹ ری چارج کریں۔“ سوہانے موبائل بیڈ پر پھینک دیا اور کارڈ اپنے پرس میں رکھ کر باہر چلی گئی۔ اس کا موڈ سخت خراب ہو چکا تھا۔

روہا باہر چلی ملی کھا رہی تھی۔ آستان اور کاشان گھر واپس آ چکے تھے۔ اب وہ دونوں کرکٹ کھیلنے میں مصروف تھے۔ زوہاب جھولا جھول رہی تھی۔ سوہانے فرج سے سیب نکالا، اور دانتوں سے کترتی ہوئی اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

”موبائل دو.....!! اس نے چلی ملی کی آخری چلی ملی منہ میں ڈال دی۔

”یہ چلی ملی کہاں سے آئی؟“ اس نے الٹا سوہا سے سوال کیا۔

”زوہالائی تھی۔ تم موبائل دو۔“ روہانے خالی پیکٹ سوہا کو دینا چاہا۔ اس نے نہیں لیا، وہ ایسے ہی گر گیا۔

”روہا.....!! بیٹا میں بہت جلد تم لوگوں کو شہر واپس لے جاؤں گا۔ بس تم دعا کرو کہ یہ کچھ وقت یہاں آسانی سے کٹ جائے۔“ شاہ زرنے بیٹی کو تسلی دی۔

”ہاں.....!! ابو میں اس دن کاشتت سے انتظار کروں گی۔ جس دن ہم یہاں سے واپس جائیں گے۔ وہ میری زندگی کا سب سے خوشگوار دن ہو گا۔ پتہ نہیں یہاں کے لوگ یہاں کیسے رہتے ہیں۔ میرا تو جیسے یہاں دم گھٹ رہا ہے۔“ روہا ایک ہی سانس میں کئی باتیں بولی چلی گئی۔

”بیٹا.....!! یہ بھی پرسکون سی جگہ ہے۔ مگر میں مانتا ہوں، نئی جگہ میں انسان تکلیف محسوس کرتا ہی ہے۔ میں بھی خود بہت تکلیف میں ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اداس نہ رہا کرو۔ سوہا بھی یہاں آ کے کچھ زیادہ اداس ہو گئی ہے۔ اس کا چہرہ کیسا کھلا گیا ہے۔ مگر ابھی ہم نے صبر سے یہ وقت گزارنا ہے۔“

”او کے ابو جی.....!! میں ذرا جھولا جھول لیتی ہوں۔ میں شروع میں بہت خوش تھی۔ مگر یہاں کی ناکافی سہولیات دیکھ کر مجھے یہاں سب عجیب لگ رہا ہے۔“ روہا بھی اور جھولنے پر بیٹھ گئی۔

”ابو.....!! مجھے ذرا موبائل چاہیے، آپ دیدیں۔“ شاہ زرنے جیب سے نکال کر دے دیا۔ سوہا نے موبائل لے لیا، وہ وہاں سے اٹھ کر کمرے میں آ گئی۔ روہا جھولا جھول رہی تھی۔ وہ موبائل ابھی دیکھ ہی رہی تھی کہ روہا اچانک کمرے میں آ گئی۔ اور اس کے ہاتھ سے موبائل چھین لیا۔ سوہا اسے دیکھ کر رہ گئی۔

”روہا کی پچی.....!! یہ کیا بدتمیزی ہے؟“ سوہا نے اس پر آنکھیں باہر نکالیں۔

”او، ڈیر، سوہا.....!!!! ابھی میری شادی نہیں ہوئی تو میری بیٹی بیچ میں کہاں سے آئی۔“ اس نے موبائل کی گیلری ایپ کھول لی۔ اور گیم اپ میں چلی گئی۔ اب وہ کوئی گیم کھیل رہی تھی۔

”روہا.....!! واپس کر دو موبائل.....!! مجھے کسی کو بہت ضروری کال کرنی ہے۔“ سوہانے ہاتھ بڑھا کر روہا سے موبائل لینا چاہا۔ مگر روہانے ہاتھ پیچھے کر

”اندر پلنگ پڑا ہوا ہے۔ جا کر لے لو۔“ سوہا نے سیب میں دانت گاڑ دیے۔

”میرا گیم تم نے خراب کیا تھا، اب تم وہیں تک لے کر جاؤ گی۔“ روہانے کہا۔

”یار.....!! میرا کوئی موڈ نہیں ہے، گیم وہیم کھیلنے کا، خود کھیل لیا کرو۔“ سوہانے بے زاری سے کہا۔

”اچھا.....!! تم کمرے سے موبائل تو لے کر آؤ۔“ روہانے ہاتھ بڑھا کر اس سے سیب لینا چاہا۔ مگر سوہا نے ہاتھ پیچھے کر کے سیب اس کی دسترس سے دور کر دیا۔

”آشآن.....!! ذرا میرے کمرے سے موبائل لے کر آؤ۔“ سوہانے آشآن سے کہا۔ اسے پتہ تھا، روہا تو کبھی کبھار بہت سست ہو جاتی ہے۔ آشآن بھاگ کر گیا، اور موبائل کمرے سے لے آیا۔

”آپنی یو موبائل.....!!“ آشآن نے کہا۔ روہا نے موبائل لے کر سوہا کو دے دیا۔

”اب تم گیم کھیلنا اشارت کرو۔“ روہانے سوہا سے کہا۔

”آپنی.....!! میں کھیل لیتا ہوں۔“ آشآن نے خوشی سے بتایا۔

”آشآن.....!! تم جاؤ.....!! کاشان کے ساتھ کھیلو۔“ روہانے رعب جھاڑا۔

”آپنی میں گیم کھیل سکتا ہوں، میں کھیل لیتا ہوں۔“ آشآن نے سوہا کی طرف دیکھا۔

”آشآن.....!! تمہاری باؤنٹنگ کی باری ہے۔ مجھے بال کرواناں.....!!“ کاشان نے چیخ کر اپنی موجودگی کا احساس دلانا چاہا۔

”سوہا.....!! پلیز پلے ٹو دا گیم.....!! روہانے معصوم سے لہجے میں کہا۔

”یار.....!! آئی ڈونٹ لائک گیم.....!! گیم رٹیل لائف میں مزہ کرتا ہے۔ موبائل کا گیم سر درد کا باعث ہوتا ہے۔“ سوہانے موبائل پھر سے روہا کی طرف بڑھا دیا۔

☆.....☆.....☆

اگلے دن سوہانے باپ سے موبائل لے لیا، اور ابراہیم کا آفس نمبر ملادیا، بتیل جاتی رہی، سوہا بھی ویٹ کرتی رہی، کچھ دیر بعد اس کے کان میں گھمبیری آواز کی بیلوسنائی دی۔

”السلام علیکم انکل۔ آپ ابراہیم انکل بات کر رہے ہیں۔“ سوہانے پہل کی۔

”وعلیکم السلام۔ جی بات کر رہا ہوں۔ آپ کون بات کر رہی ہیں؟“

”انکل پلیز زین کا نمبر مل سکتا ہے۔ میں ان کی دوست سوہا بات کر رہی ہوں، ان کا نمبر مجھ سے کہیں گم ہو گیا ہے۔ اس نے مجھے آپ کا نمبر دیا تھا۔“ سوہا کے نام پر ہی ابراہیم کے دونوں کان کھڑے ہو گئے تھے۔

”سوہا بیٹا۔۔۔!!! زین تو ابراؤ چلے گئے ہیں۔ ان کا نمبر تو بند ہے۔ اس لیے آپ کا رابطہ نہیں ہو پا رہا ہے۔ آپ اپنا نمبر مجھے چھوڑ دیں، میں آگے فارورڈ کر دوں گا۔“ ابراہیم سوہا کی بات سن کر سواٹ کا جھکاؤ کاٹھا۔ وہ جیسے انکاروں پر لوٹ پوٹ ہو گئے تھے۔

اب اسے ہوش سے سارا معاملہ سلجھانا تھا۔ اس نے بہت اپنائیت سے سوہا سے کہا۔

”جی انکل۔ اس کا واٹس ایپ نمبر تو ہوگا، میرا ان سے بات کرنا بہت ضروری ہے۔“ سوہانے منت سے کہا۔

”بیٹا جو یہاں کا نمبر ہے وہ تو بند ہے، ابھی اس نے اپنا دوسرا واٹس ایپ کا نمبر نہیں بھیجا، آپ اپنا نمبر چھوڑ دیں۔ جیسے ہی ان سے رابطہ ہوگا۔ میں آپ کا نمبر دے دوں گا۔“ ابراہیم سوہا سے بات کرنا بھی بہت برا لگ رہا تھا۔ وہ حیرانگی کا شکار تھا، اسے حیرت ہی ہو رہی تھی اگر سوہا کے پاس مین آفس کا فون نمبر تھا، تو اس کے پاس یہاں کا پتہ بھی ہو سکتا تھا۔ وہ اگر آج فون کر کے زین کے بارے میں پوچھ سکتی تھی۔ تو کل کو اسی ایڈریس پر اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے بھی آسکتی تھی۔

”جی انکل بہت شکریہ۔۔۔!!! آپ زین کو میرا نمبر دیجیے گا، اور ان سے کہہ دیجیے گا کہ سوہا آپ کی

پوئی کی دوست نے فون کیا تھا۔“ سوہانے ابرار احمد کو اپنا نمبر نوٹ کرانے کے بعد کہا۔

”جی بالکل آپ کو قطعاً فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ ابرار احمد نے رسی سا جملہ کہہ کر کال منقطع کر دی۔ وہ اتنے بات سے ہی گھبرا رہا تھا۔ وہ شدید مضطرب ہو گیا تھا۔ اس کو چین نہیں مل رہا تھا۔ وہ بے چینی سے آفس میں یہاں سے وہاں پھر رہا تھا۔ سوہا کی اس فون کال نے اس کے ہوش اڑا دیے تھے۔

☆.....☆.....☆

اس نے سارے میٹنگز کینسل کروا دیے۔ وہ آفس سے باہر نکلا اور اب اس کا رخ اپنے بیٹکے کی طرف تھا۔ اس نے فون کر کے سانول، اور نوری کو بھی بلایا تھا۔ وہ دونوں بھی پہنچنے والے تھے۔

اب وہ اپنے ساحل سمندر والے شاندار سے بیٹکے میں موجود تھا۔ اس کے ماتھے پر لکیروں کا چال سا پھیلا ہوا تھا۔ نوری، اور سانول اس کے سامنے کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔

”تم دونوں نے یہ کیسا کام کیا ہے؟ اس لڑکی کا آج میرے مین آفس فون کیا تھا۔“

”سائیں۔۔۔!! ہم نے تو اس کے سارے نمبر ضائع کر وا دیے تھے۔ اس کے نمبر تو بند ہیں۔ ہم مسلسل ٹرائی کر رہے ہیں۔“ سانول نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

”اس کے پاس میرا نمبر تھا، اگر وہ آج مجھے فون کر سکتی ہے، تو کل کو آفس بھی آ سکتی ہے۔ میں چاہتا ہوں۔ وہ لڑکی بالکل مردہ ہو جائے۔ زندہ ہو کر بھی مردوں جیسی زندگی گزراے۔ میرا بیٹا کوئی گلی محلے کا آوارہ لڑکا نہیں جس پر کسی بھی لڑکی کا دل آجائے، اور وہ اس سے شادی کر لے۔“ ابرار احمد چیخ پڑے۔

”سائیں، اس کام کے لیے بڑے سرکار سائیں سے ملنا پڑے گا۔ وہی اس لڑکی کے زندہ وجود کو مردہ کر سکتا ہے۔ وہ لڑکی ساری زندگی چار پانی پر مرگی کی حالت میں پڑی رہے گی۔“ نوری نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

”جو بھی کرنا ہے، جلدی کرنا ہوگا۔ میں مزید انتظار نہیں کر سکتا۔ میرا بیٹا میرے ہاتھوں سے نکل جائے گا۔ میں اس کی زندگی ایک معمولی سی لڑکی کے لیے تباہ نہیں کر سکتا۔“ ابرار کے نتھنے پھول گئے تھے۔

”سائیں.....!!! آپ بے فکر ہو جائیں، اس بار آپ کو مایوسی نہیں ہوگی۔ ہم نے تو اس چھو کر کے باپ کو سمجھا دیا تھا۔ مگر اسے شاید عزت راس نہیں آئی۔“ سانول نے تکبرانہ لہجہ اپنایا۔

”بھیلی بار بھی تم دونوں نے بالکل ایسا ہی کہا تھا، مگر کام بالکل بھی ڈھنگ سے نہ کر سکے۔ اگر اس بار بھی کوئی غلطی ہوئی تو انجام بہت برا ہوگا۔“ ابرار احمد چیخ رہے تھے۔

”سائیں.....!! ہم نے کام پوری ایمانداری سے کیا تھا، شاید اس چھو کر کی کو زین بابا نے آپ کا نمبر دیا ہو اور اس نے وہ نمبر آج ہی نکال کر آپ کو کال کی ہو۔ اتنا عرصہ تو اس نے گزرا لیا۔ ابھی اسے اس نمبر کا خیال آیا ہو۔“ نوری نے نگاہیں زمین پر رکھ کر باادب کہا۔

☆.....☆.....☆

سانول اور نوری دونوں کے قریبی تعلقات بڑے سرکار سے تھے۔ بڑے سرکار سندھ کا اچھا خاصہ اثر و رسوخ شخصیت کے مالک تھے۔ اس کے پاس کوئی عام بندہ نہیں پہنچ سکتا تھا۔ وہ نوجوانی میں بہت بڑے وکیل رہ چکے تھے۔ اس نے وکالت کے ساتھ، ساتھ انسانی دماغ کو قابو کرنے کا علم بھی سیکھ رکھا تھا، اس نے اپنے کیریئر میں آج تک کوئی بھی کیس نہیں ہارا تھا۔ کیونکہ وہ دوسروں کے دماغ کو قابو کر لیتے تھے۔ اس کے دماغ میں اپنا اثر چھوڑ دیتے تھے۔ وہ ٹیلی ہیٹیو کے بہت بڑے ماہر تھے۔ سینکڑوں لوگوں کو پاگل بنا دیتا تھا۔ بڑے سرکار اچھے خاصے قدا کاٹھ کے مالک تھے۔ اجڑک والی چادر کندھے پر ڈال رکھی تھی۔ اس کا جسم اچھا خاصا موٹا تازہ تھا۔ وہ دونوں کی آنکھوں میں دیر تک دیکھتے رہے۔ پھر اس نے انگلی اٹھا کر سانول کے ماتھے کے سامنے بلانی شروع کر دی۔ سانول بھی انگلی کو دیکھ کر اپنا

اپنا کام شروع کر دوں گا۔ جو کچھ تم دونوں چاہتے ہو۔ وہ ہو جائے گا۔“ بڑے سرکار بہت کم بات کرتے تھے۔

نوری اور سانول وہاں سے نکل آئے یہ ایک نیا در دسران لوگوں نے پال لیا تھا۔ یہاں سے گاؤں بھجوانا، وہاں سے پھر شہر منتقل کرنا۔ جیسے ان کے لیے اب یہ ایک کھیل بن گیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ وہ دونوں اب ایک جاننے والے کے پاس جا رہے تھے۔ سب سے پہلے وہ سوہا کا نمبر بند کروانا چاہ رہے تھے۔ اس کا جاننے والا ایک فرنگی تاجر تھا۔ وہ وہیں چلے گئے۔ سب سے پہلے شاہ زر کا نمبر بند کر دیا۔ اس کے نام سے دوسرے نمبر جتنے بھی تھے وہ بھی بند کروا دیے۔ وہ سارے نمبرز آل ریڈی ویسے بھی شاہ زر ضائع کر چکے تھے۔ دونوں نے یہ کام کر کے سکون کا سانس لیا۔ اب شاہ زر ٹینیس کو دوبارہ شہر لانے کا تھا۔ ان کا شیطانی دماغ کچھ سوچنے لگا۔

☆.....☆.....☆

سوہا اب انکی کاغذ کشی، اس دن سے ان کا نمبر بند ہو گیا تھا۔ موبائل بالکل ایسے ڈبا بن گیا تھا۔ جواب کسی کام کا نہیں تھا۔ شاہ زر نے سوچا شاید یہاں گاؤں میں ایسا ہوتا ہو۔ روہانے ٹی، وی آن کیا تھا۔ وہ ٹی، وی میں کوئی ڈرامہ دیکھ رہی تھی۔ اچانک ڈرامے کے بیچ میں کمرشل آ گیا۔ زین کا نئے برانڈ کا کمرشل تھا۔ روہا کو کمرشل کچھ زیادہ ہی پسند آیا۔ اب وہی کمرشل کچھ دیر میں بار بار نشر ہو رہا تھا۔

جیسے ہی کمرشل ختم ہوا، سوہا کمرے میں داخل ہو گئی۔ روہا کی نظریں ٹی وی اسکرین پر جمی ہوئی تھیں۔ ”کیا دیکھ رہی ہو؟“ سوہانے روہا کے ہاتھ سے ریوٹ لے کر پوچھا۔

”ڈرامہ دیکھ رہی ہوں۔ (میری زندگی کا دکھ) تم دیکھنا چاہو گی۔“ روہانے سوہا سے پوچھا۔

”ہاں.....!!! ڈرامہ کیسا ہے؟“ سوہانے اس سے پوچھا۔ اب ٹی، وی پر دوسرا کمرشل چل رہا تھا۔ یہ ٹماٹر کچپ کا تھا۔ اس میں کوئی لڑکی تھی۔

سر اس ڈائریکشن میں ہلاتا رہا تھا۔ پھر بڑے سرکار نے انگلی بالکل سیدھی کی۔ سانول کا سر بلنا بھی رک گیا۔ بڑے سرکار نے جیسے ہی دوبارہ انگلی ہلاتی شروع کر دی۔ اس بار سانول کا سر بالکل بھی نہیں ہل رہا تھا۔ بلکہ اس کی آنکھوں کی پتلیاں انگلی کے ساتھ حرکت کر رہی تھیں۔ بڑے سرکار نے اس کا دماغ قابو کر لیا تھا۔ بڑے سرکار ان کے دماغ سے کھیل رہے تھے۔ کچھ دیر کے بعد اس نے ان کے دماغ سے کھیلنا بند کر دیا۔ وہ ان کے سامنے بڑے سے تخت پر براجمان تھے۔ جیسے وہ کوئی دیوان ہو۔ ”اب بولو کیا کروانا چاہ رہے ہو؟“ بڑے سرکار گھمبیر سے لہجے میں پوچھنے لگے۔

”بڑے سرکار.....!! آپ کو تو سب کچھ معلوم ہے کہ ہم کس مقصد کے تحت یہاں آئے ہیں۔“ سانول نے نہایت ادب سے سر جھکا کر کہا۔

”میں تمہارے منہ سے سننا چاہتا ہوں۔“ بڑے سرکار نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑ کر کہا۔

سانول نے ادب سے سب کچھ بڑے سرکار کو بتانا شروع کر دیا۔ جسے غور سے بڑے سرکار سنتے رہے۔ ”ٹھیک ہے کام چندا مشکل نہیں ہے.....!!! ہو جائے گا۔ مگر.....!!!“ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ ”بڑے سرکار مگر کیا؟“ سانول نے بے چینی سے پوچھا۔

”وہ لڑکی یہاں سے بہت دور ہے۔ میں اس کی روح کو اتنی دور سے قابو نہیں کر سکوں گا۔“ بڑے سرکار نے دونوں کی طرف دیکھا۔

”بڑے سرکار.....!!! اس کے لیے ہمیں کیا کرنا ہوگا؟“ نوری نے پریشان سے لہجے میں پوچھا۔

”اُس لڑکی کو واپس یہاں لانا ہوگا۔ کیونکہ میں تو اس گاؤں میں نہیں جاسکتا۔“ بڑے سرکار مسکرائے۔ اس کی مسکان، چہرے پر بڑی کمزوری لگ رہی تھی۔

”ٹھیک ہے بڑے سرکار.....!! یہ ہمارا کام ہے۔ ہم اس کو دوبارہ شہر لے آتے ہیں۔“ ”ٹھیک ہے جیسے ہی وہ شہر منتقل ہو جاتی ہے میں

”ابھی ٹی، وی پر بہت پیارا کمرشل چل رہا تھا۔  
 ترکا قسم سے بہت ڈیٹنگ پر سٹی کا مالک تھا۔ نظریں  
 دیکھ کر بہت فریٹ ہو جاتی تھیں۔“ روہانے سوہا سے  
 واپس ریمورٹ لے لیا۔

”یہاں.....!! تو کمرشل چل رہے ہیں۔ تم  
 ڈرامہ دیکھ لو.....!! میں کچھ دیر میں آتی ہوں۔“ سوہا اٹھی  
 اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ جیسے ہی وہ نکل گئی۔ زین کا  
 نیا کمرشل پھر سے اسکرین پر آ گیا۔

”سوہا.....!! وہی کمرشل پھر سے آ گیا۔ جس کی  
 میں بات کر رہی تھی۔“ روہانے سوہا کو واپس بلائے کے  
 لیے کہا۔

”ارے.....!! کمرشل بھی کوئی دیکھنے کی چیز  
 ہے۔ تم ہی دیکھ لو یہ کمرشل.....!!“ سوہانے اونچی آواز  
 میں جواب دے کر بتایا۔ روہا زین کا کمرشل دیکھنے  
 لگی۔ کچھ دیر کمرشل چلنے کے بعد ڈرامہ آ گیا۔ سوہا واپس  
 کمرے میں آ گئی۔ ٹی، وی اسکرین پر ہیر وئن بری طرح  
 رو رہی تھی۔ اور ہیر وائے تسلیاں دے دے کر نہیں تھک  
 رہا تھا۔ سوہا کو ایسے سبز سے کوفت ہوتی تھی۔ دس منٹ تو  
 ہیر وئن کے رونے کی نذر ہو گئے۔

”یہ کیا بکواس ڈرامہ ہے۔ یہ لڑکی تو چیپ  
 ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی ہے۔ جیسے رونے کی مشین  
 ہو۔“ سوہانے روہا کو دیکھا۔

”چیپ.....!! اس کا شو ہر گم ہوا ہے۔ اور یہ  
 دوسرا ہیر وائے۔ یہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ مگر  
 ہیر وئن اپنے شو ہر کو ڈھونڈنا چاہ رہی ہے۔ کافی عرصہ ہو  
 گیا ہے۔ مگر اس کا شو ہر مل ہی نہیں رہا ہے۔ اب کہیں  
 اسے اس کی مرنے کی خبر نے اس کو رلا دیا ہے۔“ روہانے  
 سوہا کو خاموش کرنے کے لیے مختصر سی کہانی بھی سنائی۔  
 ”یہ کیسی عجیب سی اسٹوری ہے۔“ سوہانے

اسکرین کی طرف دیکھا، اب ہیر وائے ہیر وئن گاڑی میں  
 بیٹھ کر کہیں جا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد ڈرامہ ختم ہو گیا۔

”کتنا پیارا ڈرامہ ہے۔ ہائے کاش، اس کا  
 شو ہر مرا گیا ہو۔“ روہانے کمنٹ پاس کیا۔

”بالکل بھی پیارا نہیں ہے، عجیب سی کہانی ہے۔  
 شو ہر نہ ہوا کچھ ہو گیا۔ جو بیوی سے گم ہو گیا اور وہ اسے  
 ڈھونڈ رہی ہے۔“ سوہانے جیسے روہا کو دیکھا۔ جیسے ہی  
 ڈرامے کا پروڈیوٹر ہوا۔ زین کا کمرشل نشر ہونے لگا۔ سوہا  
 روہا کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”ارے.....!! وہی کمرشل پھر سے لگ گیا۔“  
 روہا خوش سے اچھل پڑی۔ سوہانے اسکرین کی طرف  
 جیسے ہی دیکھا۔ اسی لمحے بجلی چلی گئی بتی گل تو سب کچھ  
 گل۔ سوہا ہنسنے لگی۔

”بجو.....!! جو دیکھنا ہی نصیب میں نہ ہو۔ تب  
 ایسا ہی ہوتا ہے۔“ روہانے سوہا سے کہا۔

”پھر کبھی دیکھ لوں گی۔ ویسے کمرشل ہی تو  
 تھا۔ پھر نشر ہو جائے گا۔“ سوہانے اس کو دیکھا اور دونوں  
 ہنس پڑی۔

”اللہ.....!! یہ کتنا منحوس گاؤں ہے۔ یہاں اس  
 بجلی کا کتنا بڑا مسئلہ ہے۔ اللہ۔۔۔!! میری دعا میں بھی  
 سن۔ کاش آج ابو آ کر کہہ دیں سارا سامان سیٹنا  
 شروع کر دیں۔ ہم واپس اپنے شہر اپنے گھر جا رہے  
 ہیں۔“ روہانے دعا کے انداز میں دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا۔  
 ”آمین.....!! اللہ تمہاری زبان مبارک  
 کرے۔“ سوہانے دل سے آمین کہا۔ وہ بھی اب یہاں  
 کی زندگی سے تنگ آ گئی تھی۔

”چلو اٹھو.....!! باورچی خانے میں برتنوں کا  
 ڈھیر پڑا ہے۔ اور آج وہ تم نے دھوئے ہیں۔ بس تم نے  
 بہت ڈرامے دیکھ لیے ہیں۔“ سوہانے اٹھتے ہوئے روہا  
 سے کہا۔

”مجھے ماسی بننے کی کوئی ضرورت نہیں میں باہر  
 جانا چاہ رہی ہوں۔ سوہا پلیز.....!! آج تم یہ برتن  
 دھو دینا۔“ روہانے جیسے منت کی۔

”میں کوئی برتن نہیں دھورہی۔ ایک تو بجلی بھی  
 نہیں ہے۔ یہ ڈیوٹی تمہاری ہے۔ تم اپنا کام پوری  
 ایمانداری سے کر کے باہر جاؤ۔“ سوہانے روہا کو واپس  
 بٹھا دیا۔ اور خود کمرے سے باہر نکل گئی۔

گاڑی میں بٹھا دیا۔ شاہ زر کو اس کے پاس بیٹھے ہوئے کچھ ہی دیر گزری تھی۔ وہ اسے اپنا بڑا وقت سمجھ رہا تھا۔ اس کے دل میں ہزاروں وسوسے اٹھ رہے تھے۔ عورت نے ہاتھ کے اشارے سے گاڑی آگے بڑھانے کو کہہ دیا۔ گاڑی روانہ ہو گئی۔ شاہ زر کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے۔ شاہ زر اس کے منہ سے سننا چاہتا تھا۔ اچانک اس کے کانوں میں مردانہ آواز سنائی دی۔ برقع میں مرد تھا۔

”تم واپس شہر شفٹ ہو جاؤ۔ ہمارے سائیں کو کسی نے گولی مار دی ہے۔ اس کے ہزاروں دشمن تھے۔ اب تمہیں اور تمہارے گھر والوں کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔“ شاہ زر کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس نے غور سے اسے دیکھنا شروع کر دیا۔ اس کی آنکھوں کی بے یقینی صاف نظر آ رہی تھی۔

”دیکھو.....!! زیادہ حیران ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم تمہارے خیر خواہ ہیں۔ تمہاری بھلائی کے لیے یہاں آئے ہیں۔“ دوبارہ شاہ زر کے کانوں میں اسی برقع پوشی کی آواز سنائی دی۔

”اچھا.....!!! اور میں یہاں رہنا چاہوں تو پھر.....!! شاہ زر نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”تو مرضی تمہاری.....!! مگر تم ہمارے سائیں کی وجہ سے شہر بدر ہوئے تھے۔ اس لیے اب وہ اس دنیا میں رہے ہی نہیں۔ تو تم کیوں اپنے گھر والوں کو ڈر کے سائے میں زندگی گزارنے پر مجبور ہو۔ میں صرف اس لیے تم سے ملنے آیا تھا۔ تمہیں یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ جو خطرے کی تلوار تم لوگوں پر لٹک رہی تھی۔ اب وہ نہیں ہے۔ تم لوگ واپس شہر آ سکتے ہو۔“

”ٹھیک ہے۔ میں آپ لوگوں کا بے حد مشکور ہوں۔ میں اس بارے میں سوچتا ہوں۔“ شاہ زر نے اس سے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ جیسے تمہاری مرضی.....!! گاڑی روک دو۔“ اس نے ڈرائیور سے کہا۔ گاڑی رک گئی۔ شاہ زر اتر گیا۔ گاڑی آگے بڑھ گئی۔ شاہ زر کے چہرے

”اللہ.....!! اک تو یہ سوہا پیرا کوئی بھی کام نہیں کرتی ہے۔ برتن دھونے کی ذمہ داری میری ہے۔ تو بس میری ہی ہو گئی۔ کبھی بھول کر اس نے ہاتھ نہیں لگائے۔“ روہا دھپ دھپ کرتی ہوئی کچن میں چلی گئی۔ وہاں شام والے برتن بھی پڑے ہوئے تھے۔ جو اس کا منہ چڑا رہے تھے۔ سوہا باہر چلی آئی۔

☆.....☆.....☆

وہ مزے سے ہنس رہی تھی۔ اس کی ہنسی کو بریک لگ گئے۔ جب اس نے ساجل کو زوہا کے ساتھ ہنستے مسکراتے ہوئے دیکھا۔

”ارے.....!! رک گئی کیوں گئی۔ آؤ ناں.....!! ابھی میں چھوٹی سے تمہاری ہی بات کر رہا تھا۔“ ساجل نے سوہا کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

”ساجل بھائی آپ کب آئے؟“ سوہا کو یہی بہتر لگا۔ اس نے کہہ دیا۔ ساجل کو سوہا کے منہ سے بھائی سننا بہت برا لگا۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا دوسرا جا رہا تھا۔ زوہا بھاگتی ہوئی باہر چلی گئی۔ ساجل نے گڑے ہوئے منہ سے کچھ نہ کہا۔

”ساجل بھائی.....!! آئیں اندر آ جا آئیں.....!! سوہا نے اس کے چہرے پر آئے رنگوں سے مزہ لیا۔

”نن۔۔۔ نہیں میں پھر کبھی آ جاؤں گا۔“ ساجل نے گڑے ہوئے لہجے میں دھیسے سے کہا۔ وہ اب گھر سے باہر جا رہا تھا۔ اس کو حیرت ہو رہی تھی۔ سوہا کا رویہ اسے پسند نہیں آیا تھا۔

ساجل باہر جا چکا تھا۔ سوہا سوچ رہی تھی۔ ”اب تو میں اس کو بھائی کے علاوہ کسی دوسرے نام سے مخاطب نہیں کرنے والی۔“

☆.....☆.....☆

شاہ زر کے پاس آج گاؤں میں کوئی عورت آئی تھی۔ اس نے برقع پہن رکھا تھا۔ وہ بہت بڑی گاڑی میں آئی تھی۔ اس کے پاس کوئی مرد بھی تھا۔ وہ ڈرائیور کے لباس میں تھا۔ اس نے شاہ زر کو اشارے سے بلا کر

ساجل کے گھر جانا چھوڑ دیا تھا۔ اور ساجل کو بھائی کہا بھی اس لیے تھا کہ وہ اس سے پیچھے ہٹ جائے، اس کے دل میں آج بھی صرف زین ہی تھا۔

”جی ابو.....!! آپ کیا کہہ رہے تھے؟“ سوہا نے باپ کے ساتھ چارپائی پر بیٹھ کر کہا۔

”کچھ نہیں.....!! جب روہا آجائے، تو ہم مل کر بات کر لیں گے“۔ شاہ زرنے کہا۔ سوہا بچن سے پانی لے آئی، اس نے ٹرے میں پانی کا گلاس اٹھا کر شاہ زرنے کو دے دیا۔ شاہ زرنے پانی پینے لگا۔

”بیٹا.....!! تمہاری زرمینہ چچی تمہیں بہت یاد کر رہی تھی۔ کبھی اس کی طرف چکر لگالیا کرو“۔ شاہ زرنے پانی کا گلاس سوہا کو پکڑ لیا۔

”ابو.....!! میرا وہاں دم گھٹتا ہے۔ میں اس ماحول کی عادی نہیں ہوں۔ میرا وہاں ذرا سا بھی دل نہیں لگ رہا ہوتا ہے“۔ سوہا نے باپ کو دیکھا۔

”اچھا ٹھیک ہے۔ جیسا تمہیں بہتر لگے“۔ شاہ زرنے سوہا کے دل کی بات محسوس کر لی۔ روہا بچن سے باہر نکل آئی۔ اس نے باپ کو چارپائی میں بیٹھے دیکھا۔ تو نہیں چلی آئی۔

”السلام علیکم“۔ اس نے باپ کے ساتھ بیٹھتے ہوئے کہا۔

”وعلیکم السلام.....!! جیتی رہو۔ کیا ہو رہا تھا؟“ شاہ زرنے روہا کا پسینہ سے تر پتر چہرہ دیکھا۔

”کچھ نہیں.....!! بچن میں برتن دھو رہی تھی۔ یہاں بہت گرمی ہے۔ بہت زیادہ، اوپر سے واڈا والوں نے پریشان کر رکھا ہے“۔ روہا نے پٹر پٹر بتا دیا۔

”بیٹا.....!! جس وجہ سے ہم نے شہر چھوڑا تھا۔ وہ مسئلہ حل ہو گیا ہے۔ میں بھی یہاں بہت پریشان ہوں۔ میرا دل بھی یہاں سے جانا چاہتا ہے۔ مجھے اس گاؤں میں تم لوگوں کا کچھ مستقبل نظر نہیں آتا ہے“۔ شاہ زرنے کافی دیر ٹھہرنے کے بعد کہا۔ سوہا اور روہا نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ سوہا کو تو جیسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

”ابو.....!! ہم کب تک جا رہے ہیں؟“ سوہا

پر خوشی کے آثار تھے۔ وہ تیز قدموں سے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے گاڑی کے ڈرائیور کا چہرہ ٹھیک طریقے سے نہیں دیکھا تھا۔ اس نے کاؤ بوائے ہیٹ پہن رکھا تھا۔ وہ بچوں سے مشورہ کر کے یہاں سے واپس شہر جانا چاہ رہا تھا۔ اس کے بچے اس گاؤں میں بالکل بھی خوش نہیں تھے۔ اور پھر وہاں اس کی اچھی خاصی سرکاری نوکری بھی تھی۔ سوہا کی زندگی کا مسئلہ تھا۔ روہا کے بے شمار خواب تھے۔ وہ اس گاؤں میں رہ کر کبھی بھی پورے نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لیے وہ بھی دل سے چاہ رہا تھا کہ وہ سب کچھ سمیٹ کر واپس اپنی دنیا میں چلا جائے۔ وہ اس انجان سائیں کی موت سے خوش تھا۔ اب اس کا گھر بہت قریب تھا۔ وہ بے حد خوشی سے گھر میں داخل ہوا۔ اس نے گھر والوں پر ایک طائرانہ سی نظر ڈالی۔ سوہا جھولے پر بیٹھی ہوئی جھول رہی تھی۔ شاہ زرنے کہوں پر مسکان سی آگئی۔ اس نے گلا کھنکھارا، سوہا نے جیسے ہی باپ کی موجودگی محسوس کی۔ وہ فوراً جھولاروک کر اتر آئی۔

”السلام علیکم“.....!! سوہا نے باپ کو دیکھا۔ شاہ زرنے سر ہلا کر اسے جواب دیا۔

”بیٹا.....!! باقی سب کدھر ہیں؟“ شاہ زرنے گھر پر طائرانہ سی نگاہیں ڈالیں۔

”سب یہاں ہیں۔ روہا بچن میں، زوہا باہر گئی ہے۔ آستان کا شان کھیل رہے ہیں“۔ سوہا نے جیسے فر فر خبروں کی طرح معلومات دی۔

”اچھا.....!! ٹھیک ہے۔ میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔ سوچ رہا ہوں۔ اس معاملے میں میں سب کی رائے معلوم کروں“۔ سوہا کو ڈر لگا، ایک بار پہلے بھی شاہ زرنے کی زندگی ایک عجیب فیصلے سے تبدیل کر چکا تھا۔ اس بار اس کا وجود کا بننے لگ گیا تھا۔ اسے لگا کہ شاید یہ بات ساجل کے حوالے سے ہوگی۔ کیونکہ ساجل کا اسے پسند کرنا اس کے لیے بہت بڑا مسئلہ بنا سکتا تھا۔ ساجل کی ماں کی نظروں میں بھی اس کو اپنے لیے پسندیدگی نظر آنے لگی تھی۔ اس لیے تو اس نے

نے بے چینی سے سوال کیا۔  
 ”آج سے تم لوگ سب کچھ سمیٹنا شروع کر دو۔ کل ہم واپس اپنے گھر میں ہوں گے۔“ شاہ زرنے کہا۔

”سچ.....!! ابو مجھے تو یقین نہیں آرہا ہے۔ میں بہت خوش ہوں۔“ روہا ایک دم چارپائی سے اٹھ کر آنگن میں گھوم گئی۔ شاہ زر اور سوہا بھی ہنسنے لگے۔ دونوں جیسے پرسکون ہو گئے تھے۔ وہ دونوں اب باتیں کر رہے تھے۔ سوہانے دوبارہ ابرار احمد کو کال نہیں کی۔ کیونکہ ان کا سم بلاک ہو چکا تھا۔ شاہ زر نے دوسرا سم نہیں نکالا تھا۔ روہانے سامان سمیٹنا شروع کر دیا۔ سوہا کو لگ رہا تھا اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

☆.....☆.....☆

چھوٹا موٹا سارا سامان سیٹ لیا تھا۔ شاہ زر نے بھی جانے میں ہی عافیت سمجھی۔ ادرا اب اس کا دل بھی یہاں نہیں لگ رہا تھا۔ اس نے زندگی میں اس فیز سے جلد نکلنے کا فیصلہ کر لیا۔ کیونکہ اس کے بچے چھوٹے تھے۔ یہاں کے وہ عادی نہیں تھے۔ اس نے سوچا اگر وہ یہاں رہیں گے۔ تو وہ رل جائینگے۔ بری عہدیت کا اثر الگ پڑ سکتا تھا۔ اس لیے وہ رات کو زرمینہ کی طرف آئے تھے۔ اس نے ان کو آگاہ کر دیا۔ زرمینہ نے کچھ نہ کہا۔ مگر جب سے ساجل نے یہ سب سنا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا دوسرا جا رہا تھا۔ شاہ زر کے ساتھ واپسی پر ساجل بھی آگیا تھا۔ سوہا کچن میں تھی۔ روہانے اس کو کپنی دینی چاہی۔ مگر اس کی نظریں سوہا کو ڈھونڈنے کی خواہاں تھیں۔

”آپ یہاں وہاں کچھ ڈھونڈ رہے ہیں؟“ روہا نے اس کی نظروں کا جائزہ لے کر کہا۔  
 ”ہاں.....!! ایسا لگ رہا ہے۔ جیسا میرا دل کھورہا ہے۔“ ساجل نے بے چینی سے کہا۔ روہا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔  
 ”ارے.....!! دل بھی کوئی کھونے کی چیز ہے۔“ روہانے مذاق اڑانے والے انداز اپنایا۔

”ہاں.....!! دل کھوسکتا ہے۔ اور جب یہ کھو جاتا ہے۔ تب بہت مشکل سے ملتا ہے۔“ ساجل نے غم زدہ انداز میں بتایا۔  
 ”ساجل بھائی.....!! بعد میں اپنا دل آرام سے ڈھونڈتے رہنا۔ ابھی تم یہ سامان سمیٹنے میں مدد کرو۔“ روہانے مزے سے کہا۔  
 ”تم لوگ اتنے جلد کیوں واپس جا رہے ہو؟“ ساجل جیسا بے چین ہو گیا تھا۔  
 ”اس لیے کہ یہاں کا ماحول ہمیں بالکل بھی پسند نہیں آیا۔ اور جس ماحول میں انسان ایڈجسٹ نہ ہو سکے۔ وہاں رہنا بالکل فضول ہو جاتا ہے۔“ روہانے اٹھ کر کہا۔ ساجل کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ اٹھا، اور چلتا ہوا کچن میں چلا آیا۔ وہاں سوہا سارا پھیلادوا سمیٹنے میں مصروف تھی۔ وہ کچن کے دروازے میں کافی دیر کھڑے ہو کر اسے دیکھتے رہے۔ اچانک سوہا کو اپنی پشت پر کسی کی نظروں کا احساس ہونے لگا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ ساجل اسے ٹرانس کی صورت میں گھور رہا تھا۔ اس نے دوپٹہ کمر باندھ رکھا تھا۔ بالوں کو پونی میں مقید کر رکھا تھا۔ چند آوارہ لئے اس کے چہرے پر آکر گر گئے تھے۔  
 ”ارے.....!! ساجل بھائی آپ؟“ وہ اسے ایک دم اپنے سامنے دیکھ کر جربز ہو گئی۔ اس نے کمر سے باندھا ہوا دوپٹہ نکل کر کمر پر اوڑھ لیا۔  
 ”ہاں میں.....!! تم لوگ اتنے جلدی میں کیوں جا رہے ہو؟“ وہ ان کے جانے سے بے حد پریشان ہو گئے تھے۔  
 ”دیکھو ساجل بھائی.....!! سوہانے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔  
 ”سوہا بچی.....!! آپ جانتی تو ہیں۔ کیوں مجھے جلانے کے لیے ایسا کہہ رہی ہے۔“ ساجل نے بے بسی سے اسے دیکھا۔  
 ”ساجل بھائی.....!! کیا جانتی ہوں؟ آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟“ سوہانے اسے دیکھا۔



اسی لمحے پھاڑ کر گھر سے باہر پھینک دیا تھا۔ میں نے سوچا کہ تمہیں میرا جواب مل گیا ہوگا۔ وہ میرا تمہیں اگلے دن بھائی کہہ کر مخاطب کرنا ہی اس لیے تھا کہ تم سمجھ جاؤ۔ وہی میرا جواب تھا۔ مجھے شادی یہاں بالکل نہیں کرنی ہے۔ مجھے اپنا کرئیر بنانا ہے۔ زندگی میں بہت کچھ کرنا ہے۔ آگے بڑھنا ہے۔

ساجل کے دل و دماغ میں سوہا کی باتیں گونج رہی تھیں۔ وہ سمجھ چکا تھا۔ وہ جو اس کو کزن سمجھ کر کہنی دیتی رہی تھی۔ وہ اس کو غلط فہمی میں مبتلا کر گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

شاہ زر پر گاؤں میں ایک آدمی نظر رکھے ہوئے تھا۔ وہ اس نے گاؤں سے سانول کو فون کیا تھا کہ شاہ زر گاؤں سے واپس شفٹ کر رہا ہے۔ تیرنشانے پر لگ چکا تھا۔ سانول نے اس بندے کے بدستور شاہ زر کے گھر پر نگرانی رکھنے کو کہا۔ اور خود وہ نوری کے ساتھ بڑے سرکار کے پاس چلے آئے۔ اب وہ بڑے سرکار کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ بڑے سرکار کے سامنے دھویں کے مرغولے اٹھ رہے تھے۔ گھر میں مختلف جگہوں سے اگر بیویوں کی خوشبو نہیں آ رہی تھیں۔ وہ دونوں خاموش تھے۔ بڑے سرکار کے ہاتھ میں گلاب کا پھول تھا۔ اس نے پھول کو منٹھی میں مضبوطی سے تھام لیا۔ اور پھر اس کو زور دینا شروع کر دیا۔ اچانک اس کی منٹھی سے دھواں نکلتا شروع ہو گیا۔ جیسے ہی بڑے سرکار نے منٹھی کھول کر ان دونوں کے سامنے کر دی۔ وہ گلاب کا پھول جل رہا تھا۔ اور آگ کا دھواں اس سے اٹھ رہا تھا۔ مگر حیرت انگیز طور پر پھول ویسا ہی تھا۔ وہ تروتازہ تھا۔ اس نے پھول اسی طرح ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔

”تم دونوں کیا خبر لائے ہو؟“ اس نے دونوں پر نظریں گھاٹو دیں۔

”بڑے سرکار وہ لوگ اسی شہر میں شفٹ ہو رہے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ اپنا کام شروع کر دیں۔“ سانول نے یہاں تک ادب سے کہا۔

”ہوں.....!! وہ لوگ جس گلی میں رہتے

”آج مجھے جیسے شاہ زر بچانے بتایا کہ آپ سب یہاں سے شہر واپس جا رہے ہیں۔ تو میں بہت پریشان ہو گیا۔ میں آج آپ سے بات کرنے آیا ہوں۔“

”تم نے بہت اچھا کیا جو یہاں آج بات کرنے چلے آئے۔ اب کھل کر بولو کیا کہنا چاہ رہے ہو؟“ سوہا نے اس کے آنکھوں میں دیکھا۔ وہاں ستاروں کی مانند اسے چمکتے آنسو نظر آئیں۔

”سوہا جی.....!! آپ سے میں بے حد محبت کرتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ جائیں۔ آپ میرا دل ساتھ لے کر جا رہی ہیں۔ میں بہت بے چین ہو گیا ہوں۔ ساجل کے آنکھوں سے آنسو نکل آئیں۔

”ساجل.....!! یہ ماحول میرے لیے ٹھیک نہیں ہے۔ آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں یہاں زندگی گزار سکتی ہوں۔ ہم یہاں کچھ وقت کے لیے مجبور ہو کر آگئے تھے۔ اور میری تو عادت ہی ایسی ہے۔ ہر کسی نے اچھے انداز میں بات کرنے کی، اس لیے ہر کسی ہے۔ اب آپ اپنے دل کو سمجھا دیجئے گا۔“ سوہا نے اسے دیکھا۔

”سوہا جی.....!! مجھے ایسا لگا تھا کہ آپ مجھے پسند کرتی ہیں۔ آپ میرے ساتھ گھومتی پھرتی رہی تھیں۔ مجھے لگتا تھا کہ آپ بھی مجھے پسند کرتی ہیں۔ میں نے آپ کو بچے کے ہاتھ سے ایک محبت نامہ بھی دیا تھا۔ اس پر بھی آپ نے خاموشی اختیار کی۔ مجھے ایسا لگا کہ آپ بھی مجھ میں دلچسپی لے رہی ہیں۔ حالانکہ خاموشی کا دوسرا نام رضا مندی ہی تو ہوتا ہے۔“ ساجل نے نیچے زمین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”دیکھو ساجل.....!! میں ایک شہری لڑکی ہوں۔ میں جس ماحول میں پڑھی بھلی ہوں۔ وہاں ان چیزوں کو نہیں دیکھا جاتا۔ وہاں کا ماحول اس ماحول سے قدرے مختلف ہے۔ وہاں لڑکے لڑکیاں ایسے ہی گھومتے پھرتے ہیں۔ وہاں لڑکوں سے ایسی ہی بات کی جانی ہے۔ اور جس طرح تم نے مجھے لیٹر بھیج دیا۔ میں نے وہ

ضرورت کی اشیاء گھر میں سجاوہ تھیں۔ اب بس بڑے سرکار کو یہاں شفت ہونا تھا۔ بڑے سرکار سے بھی بات ہو گئی تھی۔ وہ تب یہاں پر آتے، جب سو ہالوگ یہاں شفت ہو جاتے۔ گاؤں والے بندے نے بتا دیا تھا۔ کہ صبح سے وہ لوگ روانہ ہو چکے ہیں۔ بس اب صرف ان کا انتظار ہو رہا تھا۔ یہاں نوری اور سانول ان کے منتظر کھڑے تھے۔ ان کے پہنچنے سے پہلے ہی وہ بڑے سرکار کو یہاں لانا چاہتے تھے۔ اب ان کی گاڑی کا رخ بڑے سرکار کی طرف تھا۔ گاڑی بڑے سرکار کے گھر کے گیراج میں ان کی گاڑی رکی ہوئی تھی۔ اب وہ دونوں بڑے سرکار کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔

”تم لوگوں نے گھر کا بندوبست کیا؟“ بڑے سرکار نے پوچھا۔  
 ”ہاں گھر کا انتظام ہو گیا ہے۔ اب بس وہ لوگ شام تک پہنچ جائیں گے۔“

”میں وہاں رات کو آؤں گا، میرا عمل ٹیلی بیٹھی ہے۔ میں اس رات کوکل کروں گا۔ اور جب تک اس لڑکی کی روح نکال کر قید کر لوں گا۔ وہ ساری زندگی کوے میں گزارے گی۔“ بڑے سرکار نے جیسے ہی یہ جملے ادا کیے۔ دونوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ڈور گئی۔  
 ”اس کی روح آپ کے قید میں ہو گی۔“ سانول نے آہستہ پوچھا۔

”نہیں.....! میں اپنے علم سے جسم سے روح نکال تو سکتا ہوں۔ مگر اسے قید نہیں رکھ سکتا۔ میں اس کی روح ایک گلاب کے پھول میں مقید کروں گا۔ اس گلاب کے پودے کو تمہیں دوں گا۔ تم دونوں اس کی حفاظت کرنا۔ اس کی حفاظت تمہاری ذمہ داری ہوگی۔“ بڑے سرکار نے کہا۔

”بڑے سرکار.....!! اب ہمارے لیے کیا حکم ہے؟“

”تم دونوں جاؤ، رات کو آ جانا۔ میں تم دونوں کے ساتھ اس گھر میں جاؤں گا۔ جو اس لڑکی کی گلی میں ہے۔ گھر اس کی گلی میں اس لیے ہونا چاہیے تھا۔ کیونکہ

ہیں۔ وہاں قریب میرا بندوبست کر دو۔ میں اپنے طریقے سے سب کچھ کروں گا۔“ بڑے سرکار کی بات سن کر نوری اور سانول نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

”بڑے سرکار.....!! آپ وہاں رہنا چاہتے ہیں۔ وہ علاقہ آپ کے شان شایان بالکل بھی نہیں ہے۔“ سانول نے ہاتھ جوڑ کر باادب گزارشانہ لہجے میں کہا۔

”کام کرنا ہے کن نہیں۔“ بڑے سرکار کو ان کی یہ بات بری لگی، تھی اس نے اونچی آواز میں کہا۔

”بڑے سرکار ہم آج ہی وہاں ایک اچھے گھر میں آپ کے ٹھہرنے کا انتظام کر دیتے ہیں۔“ نوری نے جیسے ہی یہ کہا۔ بڑے سرکار نے ہاتھ کے اشارے سے ان کو جانے کا عندیہ دے دیا۔ بڑے سرکار کے ہاتھ میں گلاب کا پھول بدستور چل رہا تھا۔ وہ ایک چھوٹا سا پھول تھا۔ مگر اس میں سے آگ کے شعلے ابھر رہے تھے۔ وہ دونوں اٹھ گئے۔ اب ان کی کار کا رخ شہر کے اس علاقے کی طرف تھا جہاں شاہ زر رہتا تھا۔ کافی دور کے بعد وہ اس علاقے میں پہنچ گئے۔

وہاں کافی دیر ٹھہرنے کے بعد لوگوں سے پوچھ گچھ کرنے کے بعد ان کو ایک خالی گھر مل گیا۔ وہاں کا مالک مکان قریب ہی رہتا تھا۔ وہ دونوں سیدھا ان کے گھر گئے۔ کیونکہ وہ گھر ایک مہینے کے لیے ریٹ پر لینا چاہ رہے تھے۔ مگر یہ صرف بہانہ تھا۔ کیونکہ بڑے سرکار نے گھر میں دو تین دن سے زیادہ رہائش اختیار نہیں کرنی تھی۔ اب وہ اسی گھر کے مالک مکان سے بات کر رہے تھے۔ مالک مکان نے گھر ان کو دکھا دیا۔ دونوں کو گھر اچھا لگا۔ گھر شاہ زر کے گلی میں ہی تھا۔ دونوں نے ایک مہینے کے لیے مکان کی بات کی۔ مالک مکان نے ان کوکل تک جواب دینے کے لیے ہلت کی۔ وہ دونوں بہت اچھے اخلاق سے ملے تھے۔ ان کو امید ہو چکی تھی کہ ان کو گھر مل جائے گا۔ واپس جاتے ہوئے وہ بہت پر امید تھے۔

☆.....☆.....☆

اگلے دن نوری کو گھر مل چکا تھا۔ ان دونوں نے

سے معمول کے مطابق چلائی تھی۔ وہ بھی خوش تھے۔ سب کو یہی وضاحت دیتے گئے۔  
 ”گاؤں میں ہماری کچھ زمین تھی۔ جس پر کسی نے زبردستی قبضہ کرنا چاہا تھا۔ اس لیے افراتفری میں گاؤں جانا پڑا تھا۔ بچے میرے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ ان کو بھی ساتھ لے جانا پڑا۔“ شاہ کی بات سن کر سب مطمئن ہو گئے۔ ایک ضعیف نے پوچھا:  
 ”کہو میاں.....!! اب کیا مسئلہ حل ہو گیا ہے۔“

”ہاں.....!! چچا جی.....!! اللہ نے اپنے فضل سے سب مسئلے مسائل حل کر دیے ہیں۔“ اس نے سامان میں مدد کرنے پر نوجوانوں کا شکریہ ادا کیا۔ اور ان سب کو مطمئن کر کے گھر کے اندر چلا آیا۔ سارا بھاری سامان گھر کے اندر منتقل کیا جا چکا تھا۔ اب کچھ لڑکے اس سامان کو اندر کمروں میں رکھ رہے تھے۔ شاہ زران سب کے ممنون سے ہو گئے تھے۔ زندگی آگے یہاں آسانی سے گزر رہی تھی۔ کافی دیر بعد وہ لڑکے چلے گئے۔ سوا اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ چھت پر گئی ہوئی تھی۔ اس نے یہاں آگے سب سے پہلے زین کو ڈھونڈنا تھا۔ مگر ابھی تو وہ گھر آئی تھی۔ اس نے دوبارہ باپ سے موبائل مانگا بھی نہیں تھا۔ وہ اپنا موبائل خریدنا چاہ رہی تھی۔ وہاں گاؤں میں اس نے جتنا وقت بھی گزارا تھا۔ اس نے وہ بہت مشکل اور صبر آزما گزارا تھا۔ اب اس کو لگ رہا تھا سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ واقعی سب ٹھیک ہو سکتا تھا۔ اس نے سارا سامان پہلے کی طرح سیٹ کر لیا تھا۔ وہ اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی تھی۔ اس نے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔ اس کے قریب ہی روبا کھڑی تھی۔ وہ اس کو حیرانگی سے دیکھ رہی تھی۔ کیونکہ سوا ہنس کر اُڑے جارہی تھی۔

”ارے کہیں پاگل واکل تو نہیں ہو گئی ہو؟“ روبا نے اس کو پکڑ کا جھنجھوڑا۔ اس نے روبا کو دیکھا۔  
 ”روبا.....!! آج میں بہت خوش ہو۔ تم کیا نہیں جانتی، اپنے گھر کا سکون کیسا ہوتا ہے۔ تم بھی

فاصلہ کم ہونے کی وجہ سے میں اس کی روح کو اس کے جسم سے با آسانی نکال پاؤں گا۔ مگر وہ روح کو اسی کے گھر کے قریب کسی میدان میں رکھنا ہوگا۔ اگر روح جسم سے دور ہوگی۔ تو وہ مر جائے گی۔ میں کسی کو قتل نہیں کرنا چاہتا۔ تم لوگوں نے کل تک ایک گلاب کے پودے کا انتظام کرنا ہے۔ جس میں تین گلاب کے پھول ہوں۔ وہ پودا اچھا خاصہ بڑا ہو۔ اور گلے میں ہو۔ بڑے سرکار نے ان کو نیا حکم نامہ جاری کر دیا۔ نوری اور سانول کو اس نے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ دونوں نکل آئے۔ اب ان کا رخ پودوں کی زمری کی طرف تھا۔ وہاں دونوں نے ایک خوبصورت تین کھلے پھولوں والا پودا خریدا، وہ گلے کے اندر تھا۔ دونوں نے اس پودے کو گاڑی میں رکھا۔ اور گھر لے آئے۔ اب وہ اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں کام بہت مستعدی سے کر رہے تھے۔ بس دونوں اس کام سے فارغ ہو جانا چاہتے تھے۔ کیونکہ اس میں کافی وقت برباد ہو چکا تھا۔ بڑے سرکار کو منہ مانگے پیلے دیے گئے تھے۔ وہ اس کام کو تکمیل تک پہنچانے کے پیسے پانی کی طرح بہا رہے تھے۔ دونوں نے کچھ دیر تاش کھلا۔ پھر وہ ٹی وی پر پروگرام دیکھنے لگ گئے۔ اب تو سانول ڈانسر کے چہرے پر نظر میں جما کر اس کو نگ بھی کر رہا تھا۔ کمرے میں دھواں یہاں وہاں تیرنے لگا تھا۔

☆.....☆.....☆  
 سوا کو یقین نہیں آ رہا تھا، وہ اپنے گھر کے اندر تھی۔ جب زوبا گھر کا تالا کھول رہی تھی۔ تب سوا نے دہلیز پر کھٹے خوشی کے آنسو بہائے تھے۔ وہ بے حد خوش تھی۔ آستان کا شان اور زوبا اچھلتے کھودتے کھلے دروازے سے اندر داخل ہوئے تھے۔ شاہ زرنے سامان اتارا، اب محلے والے اس کے ساتھ مدد کر رہے تھے۔ سامان اندر لایا جا رہا تھا۔ کچھ محلے والے پوچھ گچھ میں مصروف ہو گئے تھے۔ کیونکہ وہ بناتائے سب کچھ جھوڑ چھاڑ کر گئے تھے۔ شاہ زرنے کو آفس بھی دوبارہ جانا تھا۔ اسے اب کچھ پھر سے ٹھیک کرنا تھا۔ زندگی اب پھر

# جلتے گلاب

عثمان غنی خان - پشاور

آخری قسط

دو دلوں کا ملاپ اچانک چھناکے سے بکھر گیا، دونوں کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اس قدر عجلت میں وہ ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گے اور جب ایسا ہوا تو ایک انوکھا شاخسانہ سامنے آیا تو انجان سفر کے باسی گھٹ کر رہ گئے لیکن جب وقت پلٹا تو.....

ایک اچھوتی انوکھی دلنواز، فرحت بخشی دل دماغ کو گدگداتی..... شاہکار کہانی

بہت بلکے انداز میں بالکل دھواں نظر آرہی تھی۔ وہ خوشبو ہلتی جلتی رقص کرنے لگی، پھر وہ کمرے سے نکلتی چلی گئی۔ اب وہ گلی میں کسی کی تلاش میں پھر رہی تھی۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ گھر اسکوٹ پھیلا ہوا تھا۔ وہ دھواں جیسے کسی کو تلاش کر رہا تھا۔

اچانک دھواں سوہا کے گھر کے سامنے رک گیا اور پھر اونچا ہو کر دیوار کے پار چلا گیا۔ اب وہ سوہا کے گھر کے اندر تھا۔ اس نے پورے گھر میں جیسے چکرانا شروع کر دیا۔ اب وہ سوہا کے کمرے میں پھر رہا تھا۔ سوہا روہا کے قریب ہی سو رہی تھی۔ دونوں کے سنگل بیڈ قریب تھے۔ دھوئیں نے دونوں کے ارد گرد کئی چکر لگائے۔ پھر وہ سوہا کے ناک میں گھس گیا۔ اب کمرے میں دھواں بالکل بھی نظر نہیں آرہا تھا۔

اچانک سوہا کے وجود سے کچھ اٹھنا شروع ہو گیا، وہ سفید سا دھواں تھا۔ جو دھیرے دھیرے سوہا کے جسم سے نکل رہا تھا۔ جب وہ پوری طرح سے سوہا کے جسم سے نکل گیا، تو اس نے سوہا کا روپ دھار لیا۔ وہ سوہا کی روح تھا۔ اب وہ بنے چینی سے پورے کمرے میں چکرانے لگ گیا۔ کچھ دیر چکرانے کے بعد وہ دھیرے دھیرے باہر آنے لگا۔ جیسے کوئی شش زبردستی روح کو

ایک بہت بڑی گاڑی اسی تنگ اس محلے میں آ کر رک گئی۔ گلی بالکل سناں تھی۔ کوئی ذی روح نہیں تھی۔ بڑے سرکار کے لیے سانول نے گاڑی کا دروازہ کھولا، اس نے بڑے کروفر سے قدم باہر نکالا۔ اب وہ اسی کرائے کے گھر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اس کا ڈرائیور گاڑی واپس لے جا رہا تھا۔ بڑے سرکار کمرے میں آ گئے۔ انہوں نے باہر سے ہی شاہ زر کا گھر دیکھ لیا تھا۔ وہ اس گھر سے چند گھر ہی دور تھا۔ بڑے سرکار نے گلاب کا پودا اپنے سامنے رکھا۔ اب وہ کمرے میں اسیلے تھے سانول اور نوری کمرے سے باہر نکل گئے۔ وہ ٹیلی پیٹھی کے ذریعے سوہا کی روح نکال کر اسی گلاب کے پودے میں قید کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے عمل شروع کرنا تھا۔ بڑے سرکار کے سامنے اسی گیلے میں گلاب کا پودا موجود تھا۔

اس نے آنکھیں بند کر دیں اور گلاب کے پودے کی خوشبو کو محسوس کر کے عمل پڑھنا شروع کر دیا۔ گلاب کی ساری خوشبو دھوئیں کی مانند نکلتی ہوئی رقص کرنے لگی۔ بڑے سرکار نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ انتہائی سرخ ہو گئی تھیں۔ انہوں نے اپنے ذہن سے گلاب کی خوشبو کو اپنے تابع کر لیا۔ اب گلاب کی خوشبو



اپنی طرف کھینچ رہی ہو۔

بلا یا۔ وہ دونوں اب حیرت سے جلتے گلاب کو دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں کی حیرانگی صاف طور پر دیکھی جاسکتی تھی۔

”تم دونوں اس گلاب کے پودے کو کسی میدان میں لگا دو۔ یہ کسی کو نظر نہیں آئے گا۔ ہاں یہ پودا تم دونوں کو نظر آسکتا ہے۔ مجھے نظر آسکتا ہے۔ جس نے یہ کام کروایا ہے، اس کو بھی نظر آسکتا ہے اور اس لڑکی کے عاشق کو بھی نظر آسکتا ہے۔ اگر اس کا عاشق اس پودے کو دیکھ بھی لے، تو وہ اسے نکال نہیں پائے گا کیونکہ میرا کہہ گیا عمل اس کو کرنٹ مارے گا۔ وہ اس کی تصویر ایتار سکتا ہے۔ یہ گلاب جس میں لڑکی کی روح قید ہے۔ اس پودے کو زمین میں عام پودوں جیسا ہی داب دو۔ اگر اس کو پورا زمین میں دفن کر دو گے۔ تو یہ پودا مرجھا جائے گا۔ اس کی خوشبو (روح) نکل کر واپس اس لڑکی کے جسم میں چلی جائے گی اور وہ لڑکی اسی لمحے دوبارہ ٹھیک ہو جائے گی۔ جب تک یہ پودا زمین میں رہے گا۔ اس لڑکی کو کچھ نہیں ہوگا، وہ بھی زندہ رہے گی۔ کیونکہ اس پودے کے پھولوں کی خوشبو اس لڑکی کے جسم میں ہے۔ وہ زندہ رہے گی۔ مگر مردوں جیسی ہوگی۔ لیکن اگر کسی نے اس لڑکی کے جسم سے کھینے کی کوشش کی، تو گلاب کی خوشبو اس لڑکی کے جسم سے نکل جائے گی اور وہ مرجائے گی۔ کسی طور پر اس لڑکی کے ساتھ ایسا نہیں ہونا چاہیے، جب بھی، جی ایسا ہوگا۔ اس پودے کی آگ میں انہوں کا منظر نظر آنے لگے گا۔ تب تم اگر قریب ہو تو فوراً گرٹھا کھود کر اس پودے کو دفن کر دینا۔ وہ لڑکی واپس ٹھیک ہو جائے گی اور اپنا بچاؤ کر سکے گی۔“ بڑے سرکار نے دونوں کو سب کچھ سمجھا دیا۔

”بڑے سرکار.....!! اگر ہم اس لڑکی کو مارنا چاہیں۔ تب ہمیں کیا کرنا ہوگا؟“ یہ سوال نوری نے پوچھا۔ وہ اس پودے کو دیکھ کر ڈر رہا تھا۔ جیسے وہ اسے جی آگ لگا دے گا، اس نے جب جلتے گلاب کے تینوں پھولوں کو دیکھا، تو اس میں اسے سوا کا عکس دکھائی دینے لگا۔

کچھ دیر بعد سوا کی روح اب گھر سے باہر تھی۔ جیسے وہ کسی کے قابو میں ہو، روح اب اسی گھر کی طرف آ رہی تھی۔ جس میں بڑے سرکار عمل کر رہے تھے۔ روح اس گھر میں داخل ہوئی اور بڑے سرکار کے سامنے وہ رک گئی۔ بڑے سرکار نے گلاب کو دیکھا، وہ گلاب کا پودا بالکل بے جان لگ رہا تھا۔ جیسے مرجھا رہا ہو، بڑے سرکار نے اپنی آنکھوں کو روح پر مرکوز کر دیا۔ بڑے سرکار کی آنکھوں میں جلن ہونے لگی۔ بڑے سرکار نے مرجھائے ہوئے پودے کی طرف دیکھا اور پھر روح کو دیکھا۔ سوا کی روح کو تکلیف ہونے لگی۔ بڑے سرکار نے اس کو قابو کر لیا تھا۔ اب انہوں نے روح کو گلاب میں جذب ہوئے پر زور دیا۔ روح نے تکلیف سے ادھر ادھر دیکھا، پھر وہ گلاب کے اندر داخل ہو گئی۔ بڑے سرکار کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رقصاں ہو گئی۔ وہ ہنس رہے تھے۔ انہوں نے گلاب کو دیکھا اور گلاب تازہ پودے کی طرح کھل اٹھا اور پھر انہوں نے بہت گہری سانسیں لیں۔ مگر کمرے میں گلاب کی خوشبو کبھی بھی نہیں تھی۔

بڑے سرکار نے گلاب کے پودے پر نظریں مرکوز کر دیں۔

اچانک کچھ دیر بعد گلاب کے پودے نے آگ پکڑ لی۔ اب وہ آگ کے شعلوں میں تھا۔ بڑے سرکار ہنس رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں گلاب کے شعلے نظر آ رہے تھے۔ بڑے سرکار نے خوشی سے دونوں آنکھیں بند کر لیں۔

”جس طرح انسان کے اندر روح ہوتی ہے۔ اسی طرح گلاب کے اندر خوشبو ہوتی ہے۔ میں نے اپنے عمل سے دونوں کو ایک دوسرے سے تبدیل کروا دیا ہے۔ اب اس گلاب میں روح رہے گی۔ اور سوا کے جسم میں گلاب کی خوشبو۔“

بڑے سرکار نے آخر میں قہقہے لگانے شروع کر دیے۔ انہوں نے کچھ دیر بعد سوا نول اور نوری کو

”اگر تم دونوں نے اس لڑکی کو مارنا ہی ہے، تو مجھ سے اتنا بڑا عمل کیوں کروایا؟ سیدھا گولی سے مار دیتے۔ ایسے فضول میں میرا اتنا ٹائم برباد کر ڈالا۔“ بڑے سرکار نے غصے سے ان پر آنکھیں نکالیں۔

”بڑے سرکار.....! ہم اس لڑکی کو مارنا نہیں چاہ رہے ہیں۔ اگر کل ابراہر سائیں اس چھوڑی کو مارنا چاہتے۔ تو ہم کیا کریں گے؟ ہم صرف طریقہ جاننا چاہتے ہیں کیونکہ ابراہر سائیں کے مزاج کا کچھ پتہ نہیں چلتا ہے۔“ سانول نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔ وہ جیسے بڑے سرکار کے قدموں میں بیٹھ گیا تھا۔

”پھر اس پودے کو زمین سے نکال کر سمندر برد کر دینا اور جیسے ہی یہ سمندر کی تہہ میں جائے گا۔ اس سے روح نہیں نکل سکے گی۔ کیونکہ پانی کے اندر پودا کافی دنوں تک تازہ رہتا ہے۔ اس طرح وہ لڑکی تڑپ تڑپ کر مر جائے گی۔ یہی اس لڑکی کے مرنے کا واحد حل ہے۔“ بڑے سرکار نے ساری بات بتا دی۔

”ٹھیک ہے بڑے سرکار.....! ہم اسے لے کر جا رہے ہیں۔“ سانول نے کہا۔

”میں بھی یہاں سے نکل رہا ہوں، تم لوگ صبح مالک مکان سے کہہ دینا کہ ہمیں یہ مکان پسند نہیں آیا۔“ بڑے سرکار نے کہا اور اٹھ کر چلے گئے۔ گاڑی باہر آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ بڑے سرکار نے باہر نکلنے کے فوراً بعد ڈرائیور کو کال کر دی تھی۔ اب وہ گھر سے نکل رہے تھے۔ ان کے جانے کے بعد سانول اور نوزی نے گلاب کا گلا اٹھایا اور اسے لے جا کر بڑے میدان میں لگا دیا۔ ان دونوں نے اس پودے پر کافی دنوں تک نظر رکھی۔ وہ واقعی ان کے سوا کسی کو نظر نہیں آ سکتا تھا۔ کیونکہ کافی سارے لوگ وہاں آئے تھے، جو چلتے گلاب کے پھول کی جگہ پر گھوم پھر کر چلے جاتے، مگر کچھ نوٹس ہی نہ کر پاتے۔

☆.....☆.....☆

مالک مکان کو ان دونوں نے مطمئن کر دیا۔ پوری پے منٹ کر دی گئی۔ وہ بے چارہ بھی کیا کر سکتا تھا۔ اس نے بس صرف ایک مہینے کا کرایہ شرائط کے طور پر

لے لیا اور ایڈوانس واپس کر دیا۔ ابراہر احمد نے باقی تمام رقم نوزی اور سانول کو دے دی۔ مگر ساتھ میں ہر رات جلتے گلاب کے پودے پر خاص نظر رکھنے کو کہہ دیا۔ وہ دونوں تب سے ہر رات میدان میں جاتے اور جلتے گلاب کے پودے کو دیکھتے۔ ان کو یقین ہو گیا تھا کہ اب کبھی زمین سوہا تک نہیں پہنچ پائے گا۔ وہ دونوں ابھی تک پولیس کے کسی دوسرے معاملے میں نہیں پڑے تھے۔ دونوں نے جتنے بھی جرائم کیے تھے۔ وہ ابھی تک عدم ثبوت کی بنا پر پولیس کے دسترس سے دور تھے۔

انہوں نے سوہا پر نظر رکھی، وہ ان کو کوسے کی حالت اسپتال میں ملی۔ وہ دونوں اپنا کام مسلسل کیے جا رہے تھے۔ زندگی کافی تیزی سے گزر رہی تھی اور سوہا کے اسپتال میں ایڈمٹ ہونے کی وجہ سے شاہ زر کے گھر پر تالا ابھی تک جوں جوں پڑا ہوا تھا۔

☆.....☆.....☆

اگلے دن گھر والوں کو سوہا کو مرنے کی حالت میں ملی۔ یہ گھر والوں کے لیے کسی قیامت سے کم نہیں تھا، کچھ جاہل لوگ تو اسے مردہ سمجھ رہے تھے۔ سارے گھر والوں کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ وہ لوگ اسے اسپتال لے کر چلے گئے۔ شاہ زر اس نئی افتاد پر سخت پریشان ہو گئے تھے۔ مگر جوان بیٹی تھی اور انہیں پیاری بھی بہت تھی۔ انہوں نے سوہا کے علاج کے لیے اپنی ساری جمع پونجی لگانی شروع کر دی۔ وہ کئی دنوں تک اسپتال میں رہے۔ اسپتال میں کچھ ڈاکٹرز اور چند لوگوں کو لگنے لگا کہ سوہا کے وجود سے گلاب کی خوشبو آتی ہے۔ ڈاکٹرز نے یہ معہ سلجھانے کی بے حد کوشش کی۔ مگر وہ تہ تک نہیں پہنچ سکے۔ مگر ڈاکٹرز نے یہ کیس کسی سے ڈسکس نہیں کیا۔ اگر میڈیا کو بھنک بھی لگ جاتی تو وہ اپنی بے ہودگی، چنانا شروع کر دیتے۔ کچھ عرصے تک ڈاکٹرز سوہا کو ڈراپس کے ذریعے خوراک فراہم کرتے رہے۔ شاہ زر کو دوبارہ نوکری مل چکی تھی۔ انہوں نے دفتر والوں کو اپنی چھٹیوں کی توجی بیٹی کی بیماری بیان کر دی۔ وہ لوگ اس کی بیٹی کو دیکھنے اسپتال آئے بھی تھے۔

وہ بالکل کسی بے جان لاش کی طرح تھی۔

ڈاکٹر زکا کہنا تھا کہ ”یہ زندہ ہے اور سانس لے رہی ہے۔ شاید کسی صدے کی وجہ سے اس کی ایسی حالت ہو گئی ہے۔“ مگر عجیب بات یہ ہے کہ اس کے وجود سے گلاب کی خوشبو آتی ہے۔ ”بہت سارے لوگوں کو سوبا کے کوسے میں جانے کا فہم تھا۔ مگر کوئی کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ پہلے پہل تو ڈاکٹر زکس سوبا کو گھر شفٹ کرنا چاہتے تھے۔ مگر شاہ زرا ایسا نہیں چاہتے تھے۔ وہ اسپتال میں سوبا کو تب تک رکھنا چاہتے تھے۔ جب تک وہ واپس ٹھیک نہیں ہو جاتی۔ انہوں نے گاؤں کا مکان بھی بیچ دیا۔ کیونکہ سوبا کے علاج کے لیے پیسوں کی اشد ضرورت تھی۔ سوبا کے گھر پر پھر سے تالا لگ چکا تھا۔ اس کے گھر والے اب پھر سے اسپتال میں گھن چکر بن کر رہ گئے تھے۔

☆.....☆.....☆

ایک دن زین پھر سوبا کے محلے میں آتا تھا۔ اس نے سوبا کے گھر پر پڑا تالا دیکھا تو ناامید ہو کر چلا گیا۔ اس دن اس نے سر پر کیپ پہن رکھی تھی اور منہ سنوٹی اجرک سے چھپایا تھا، وہ یہاں لوگوں کا جھوم نہیں چاہتا تھا، ان دنوں زین اسٹار بن چکا تھا۔ وہ بہت زیادہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا تھا۔ اس نے بڑی مشکلوں سے اپنے بڑی شیڈل میں سے وقت نکال کر سوبا کے گھر کا چکر لگایا تھا۔ مگر وہ اسے نہیں مل سکی تھی۔ وہ وہاں سے واپس چلا گیا۔ اس کی زندگی میں اب سکون نہیں تھا۔ شاہ زر جیسے گھر کی راہ تک بھول گئے تھے۔ ان کی زندگی بس اسپتال اور دفتر تک محدود ہو گئی تھی۔ روبا نے دوبارہ اپنا کالج جوائن کر لیا تھا۔ وہ کالج جانے لگی۔ کالج سے سیدھا وہ اسپتال جاتی۔ ڈاکٹر زکس سوبا کو گھر ڈسپانچ نہیں کر رہے تھے۔ کیونکہ اس کے پاس کسی تیار دار کا ہونا بھی بہت ضروری تھا۔

کوسے میں بڑی ہوئی سوبا کیسے اکیلے گھر میں رہ سکتی تھی اور پھر ڈاکٹر زکس جو بھی شاہ زر کی بات درست لگی۔ انہوں نے ان کی بات مان لی۔ گھر میں وہ اکیلے

پڑ جاتی یہاں تو کبھی شاہ زر ہوتے اور وہ جب نہیں ہوتے تو روبا ہوتی اور روبا اور چھوٹے بہن بھائی آستان اور کاشان بھی کبھی کبھار آ جاتے۔ سوبا کو پرائیویٹ روم میں شفٹ کر دیا تھا۔ شاہ زر نے ساری زندگی جو جمع پونجی کی تھی۔ اب وہی ان کے کام آ رہی تھی۔ شاہ زر کو کچھ یہاں اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ مگر انہوں نے صبر اور شکر سے جیسے حالات کا مقابلہ کرنا شروع کر دیا۔ ڈاکٹر زکس کو فس فیصد امید ہو چکی تھی۔ ان کو لگتا تھا کہ کسی بھی لمحے سوبا دوبارہ ہوش میں آ سکتی ہے۔ مگر ان کو وقت کا پتہ نہیں تھا۔

شاہ زر کو اب معجزے کا انتظار تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ ناامید ہو رہے تھے۔ مگر ہر دعا اس کی سوبا کے نام سے شروع ہو کے اسی پر ختم ہو جاتی تھی۔ شاہ زر کا وقت اب عبادت میں لگنے لگا تھا۔

☆.....☆.....☆

ڈاکٹر عاشر بالکل یگ ڈاکٹر تھا۔ اس نے جب سوبا کو دیکھا۔ تو وہ اسے بہت اچھی لگی۔ اس نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ ڈاکٹر عاشر نے سوبا کے کوس پر خصوصی توجہ دینی شروع کر دی۔ وہ سوبا کو خاص پیشرفت سمجھ کر اس کے پاس وقت بھی گزارنے لگا۔ اسے سوبا کے کمرے میں آکر گلاب کی خوشبو کی مہک محسوس ہوتی۔ اسے لگتا کہ سوبا کسی جادو کے قید میں ہے۔ اور وہ جادو گر۔ یہاں کہیں قریب ہے۔ مگر اس نے اپنے خیالات کا اظہار اس لیے کسی سے نہ کیا۔ اسے لگتا تھا کہ کوئی اس کی بات کا یقین نہیں کرے گا اور اٹنا اسے خطی اور پاگل قرار دیا جائے گا۔ جب بھی اسے وقت ملتا۔ وہ وہاں چلا آتا۔ وہ سوبا کے وجود کی خوشبو کو اپنے لیے انعام جیسا محسوس کرنے لگا۔ اسے پہلے پہل لگتا تھا، یہ گلاب کی پھولوں کی خوشبو صرف وہی محسوس کرتا ہے اور پھر وہ رفتہ رفتہ دل ہی دل میں اسے چاہنے لگا۔ شاہ زر کے اسپتال کے بلز میں بھی اسی نے خصوصیت کی کرا دی۔ جس پر شاہ زر اس کا دل سے ممنون تھے۔ کافی وقت گزرتا گیا۔ ڈاکٹر عاشر کے دل میں سوبا کی محبت کا جذبہ پروان چڑھ



اور زندہ ہے؟ ویسے امید ہے بہت جلد اس کا کومہ ختم ہو جائے گا۔“ ڈاکٹر عاشر سوہا کی فائل دیکھتے ہوئے بولا۔  
 ”ویسے آپ کا نام کیا ہے؟“ ڈاکٹر عاشر نے پوچھا۔

”روہا۔۔۔!!“ روہا نے جھٹ سے بتایا۔  
 ”روہا۔۔۔!! آپ کو نہیں لگتا ہے کہ اس کمرے میں جیسے گلاب کی خوشبو قید ہے۔ میں جب بھی آتا ہوں۔ یہاں گلاب کی خوشبو محسوس کرتا ہوں۔ کیا آپ کو بھی گلاب کی مہک محسوس ہوتی ہے۔“ ڈاکٹر عاشر نے سوہا کی فائل میڈ کے سرہانے رکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں، یہ خوشبو کمرے کی نہیں ہے۔ یہ خوشبو پیہ نہیں کیسے سوہا کے وجود سے پھوٹی ہے۔ جب سے یہ خوشبو اس کے وجود کا حصہ بنی ہے۔ تب سے مجھے کچھ بھی ٹھیک نہیں لگ رہا ہے۔“ روہا نے اٹھتے ہوئے ڈاکٹر کو دیکھا۔ روہا کی بات سن کر ڈاکٹر سنجیدہ ہو گیا تھا۔

”ہاں۔۔۔ مجھے بھی ایسے ہی لگتا ہے۔ جب یہ ٹھیک تھیں۔ تو کیا تب بھی اس کے وجود سے گلاب کی خوشبو محسوس ہوتی تھی؟“ ڈاکٹر عاشر مزید جاننا چاہ رہا تھا۔

”نہیں۔ تب تو ایسا کچھ بھی ہم نے محسوس نہیں کیا تھا۔ یہ تو جس دن سے کومے میں گئی ہے۔ تبھی سے یہ خوشبو اس کے وجود سے محسوس ہوتی ہے اور بہت اچھی خوشبو ہے۔ بندے کا دل اس خوشبو کی وجہ سے بالکل پرسکون ہو جاتا ہے۔“ روہا نے اسے بتایا تو ڈاکٹر عاشر نے اثبات میں سر ہلایا۔

”اچھا۔ ویسے مجھے لگتا ہے۔ یہ کہیں کوئی جادوئی چکر نہ ہو؟ آپ کیا کہتی ہیں؟“ ڈاکٹر عاشر نے پوچھا۔

”نن، نہیں۔ میرے خیال میں ایسا کچھ نہیں ہے۔ ہم پر جادو کون کرے گا؟ ہماری کسی سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟ اور ویسے بھی ہم جادو کو نہیں مانتے ہیں۔ میرے خیال میں جادو کرنا صرف افسانوی کہانیوں میں ہوتا ہے۔“ روہا نے بولا تو ڈاکٹر کچھ دیر سوچتا رہا۔

”اب آپ کیا سوچ رہے ہیں؟“ روہا نے پوچھا۔  
 ”کچھ نہیں ویسے میرا اپنا ذاتی خیال تھا۔ کیا

رہا تھا۔ وہ جب اس سے دور ہوتا تو اس کا دل بے چینی کا شکار ہوتا۔ وہ خود بھی بہت خوبصورت شخصیت کا مالک تھا۔ زندگی اسے اچھی لگنے لگی۔ اس کو بھی جینے کا مقصد سمجھ آنے لگا۔ اس کو لگتا کہ یہ جو سوہا کے وجود سے گلاب کی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔ یہ صرف اس کے لیے ہے۔ وہ اکثر ہنستا مسکراتا۔ جی کرتا وہ سوہا کو اسی طرح دیکھتا رہے اور اس کے وجود سے اٹھتی خوشبو کو محسوس کرتا رہے۔ وہ کبھی کبھار جان بوجھ کر بار بار اسے دیکھنے آ جاتا اور اس کے وجود سے گلاب کی پھوٹی خوشبو کو لمبے سانس لے لے کر اپنے وجود میں داخل کرتا۔

☆.....☆.....☆

ڈاکٹر عاشر کو سوہا کے دونوں بھائی بھی بہت پسند تھے۔ وہ ان دونوں کو دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔ ان کا باپ شاہ زربھی اسے اچھا لگتا تھا۔ اس کی ایک بہن تھی۔ جو ہر وقت کالج یونیفارم میں کسی نرس کی طرح موجود ہوتی۔ روہا کالج سے سیدھی اسپتال آ جاتی تھی۔ اس لیے ڈاکٹر عاشر کو لگتا تھا کہ یہ سوہا کی پرائیویٹ نرس ہے۔ جو اس کے روم میں ڈیوٹی دے رہی ہے۔ بعد میں اسے پتہ چلا۔ تو وہ کئی دنوں تک اس بات پر مسکراتا رہا۔ وہ کالج جا کر سیدھا اسپتال آ جاتی تھی۔ آج بھی وہ کمرے میں راولڈ کے لیے آیا تھا۔ تو روہا قریب ہی کھڑی تھی۔ اس نے سمجھا کہ کوئی نرس ہے۔ مگر جب اس نے اسے نرس کہہ کر پکارا اور وہ جب مڑی تو اس نے ڈاکٹر عاشر کو دیکھا۔  
 ”ہیلو۔۔۔!! کیسی ہو؟ آپ کالج یونیفارم میں ہوتی ہیں۔ تو میں سمجھتا ہوں۔ آپ نرس ہیں؟“ ڈاکٹر عاشر نے اس سے پوچھا تو اس نے کندھے اچکائے۔  
 ”ڈاکٹر صاحب۔۔۔!! میں ٹھیک

ہوں۔۔۔!! پلیز۔۔۔!! میری بہن کو کیا ہوا ہے؟ یہ کیسے ٹھیک ہو سکتی ہے؟ آپ کچھ کریں ناں۔۔۔!! ورنہ کیا ہم ساری زندگی اسی طرح اسپتال میں گھن چکر بن کر گھومتے رہیں گے۔“

”تمہاری بہن کو کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔۔۔!! یہ کومہ میں ہے۔۔۔!! بس سانس لے رہی ہے۔۔۔!!

کہانیاں پڑھتے ہیں۔ تبھی ایسا سوچ رہے ہیں۔ مگر یہ کہانیاں تو بچوں کے لیے لکھی جاتی ہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

☆.....☆.....☆

زین گھر کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ جیسے ہی وہ اٹھا، اس نے سوچنا شروع کر دیا۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ٹکڑی میں کھڑا ہو گیا تھا۔ جیسے ہی اس نے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔ وہاں اس کی امی زرتا شینٹھی ہوئی تھیں۔ اور وہ ایکلی تھی۔ وہ بہت پریشان لگ رہا تھا۔ جوں جوں اس کو کامیابی مل رہی تھی۔ وہ مزید بے چین ہو رہا تھا۔ اس کی پریشانیوں سوہا کی طرف سے مزید بڑھ رہی تھیں، مگر وہ سوئی کی طرح ایسے گم ہو گئی، جیسے سوئی بھوسے کی ڈھیر میں گم ہو جاتی ہے۔

”سوہا۔۔۔!! تم کہاں گم ہو گئی ہو؟ میں نے تمہیں ہر جگہ ڈھونڈ لیا ہے۔ مگر تم نہیں ملی۔ اگر تم مجھے نہیں ملی، تو میں مر جاؤں گا۔ اب یہ ٹینشن مجھ سے مزید برداشت نہیں ہوتی ہے۔ میں نے تمہارے لیے ایک ننگ شروع کی تھی تاکہ تم مجھے کہیں نہ دیکھ کر رابطہ کر لو۔ ویسے تم کیوں ایسے گم ہو گئی؟ میں سینکڑوں مرتبہ تمہارے گھر گیا۔ مگر تمہارے گھر کا وہ تالا کبھی کھلتا ہی نہیں ہے۔ سینکڑوں مرتبہ وہاں کے چکر لگائے ہیں۔ مگر ہر بار ناامیدی میرے صبر کا امتحان لیتی ہے۔ مگر میں بھی تمہیں ڈھونڈ کر رہوں گا۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔ چاہے اس کے لیے میں زندگی کے آخری سانس تک کیوں نہ پہنچ جاؤں۔ میں کبھی کسی سے شادی نہیں کروں گا۔ میں تم سے اپنی وفات مرتے دم تک نبھاؤں گا۔“ وہ مڑا اور باہر جانے لگا۔ باہر آ کر اب وہ اپنی مام کے پاس تھا۔ ان کے ہاتھ میں کافی تھی، جو وہ گھونٹ گھونٹ پی رہی تھیں۔ زرتا شینٹھی اسے دیکھا، تو مسکرائیں۔

”مام۔۔۔!! ڈیڈ کہاں گئے ہیں؟“ وہ لان میں مام کے سامنے بیٹھ گیا۔

”تمہارے ڈیڈ۔۔!! اپنے دوست سے ملنے گئے ہیں۔ زین تمہارے ڈیڈ تمہاری شادی ماہ نور سے

آپ نے وہ کہانی سنی ہے۔ جس میں ایک شہزادی پر جادو کیا جاتا ہے۔ اور وہ جادو کے زیر اثر سو جاتی ہے۔ اور پھر ایک شہزادہ آ کر اس کو دیکھ کر محکم ہو جاتا ہے اور جیسے ہی اس کی آنکھوں سے آنسو نکل کر اس شہزادی کے چہرے پر گرے ہیں۔ تو شہزادی اٹھ جاتی ہے۔ جادو کا سارا اثر ختم ہو جاتا ہے۔“ ڈاکٹر عاشر بولا تو روہا دوپٹی سے سن رہی تھی۔

”ویسے سنی تو ہے۔ مگر وہ کہانی تھی۔ یہ حقیقت ہے۔ اس طرح سے سچائی میں نہیں ہوتا ہے۔ پتہ نہیں پاگل رائٹر ہوتے ہیں، جو کچھ بھی لکھ دیتے ہیں۔“ روہا نے مسکرا کر بتایا۔

”میرے خیال میں ہمیں ٹرائی کر لینی چاہیے۔ ہو سکتا ہے۔ ایسا ہو جائے۔ یہ کہانی سچ ہو جائے۔“ ڈاکٹر عاشر نے اسے دیکھا۔ اس کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔

”ویسے آپ ڈاکٹر ہو کر ایسے غیر حقیقی باتیں کر رہے ہیں۔ اس ویری انٹریٹنگ مگر مجھے یقین نہیں آرہا ہے۔ ان باتوں کو میں وقت کا ضیا سمجھتی ہوں۔ آپ ان باتوں سے زیادہ میری بہن کے علاج پر توجہ دیں۔ تو بہت مہربانی ہوگی۔“ روہا نے کہا اور پھر ہنس دی۔

”ڈاکٹر بھی عام انسان ہی ہوتا ہے۔ اور وہ بھی دوسرے عام لوگوں کی طرح الگ سوچ سکتا ہے۔ خیر آپ کو یقین کیوں نہیں آرہا ہے؟ کوئی تو وجہ ہوگی؟“ ڈاکٹر عاشر نے پوچھا۔ روہا سے دیکھتی رہی۔

”کیونکہ ہم آج کے دور میں رہتے ہیں۔ آج کل کے زمانے میں کوئی شہزادے شہزادیاں نہیں ہوتی ہیں۔ بھلا میں تو یہ سوچ کر ہنس لیتی ہوں، شہزادیوں کا دور بھی کوئی ہوتا تھا؟“

”ہوں، یہ باتیں بھی بالکل صحیح ہیں۔ خیر میں جا رہا ہوں۔ آپ ان کا خیال رکھیے گا۔ اور آپ ان کے لیے دعا کیا کریں، سنا ہے۔ دعا میں بہت طاقت ہوتی ہے۔“ ڈاکٹر عاشر کمرے سے باہر نکل گیا۔ اور روہا ہنسنے لگی۔

”لگتا ہے۔ ڈاکٹر عاشر بھی بہت رومینک

کرنا چاہتے ہیں۔ زین اگر تمہاری زندگی میں کوئی نہیں ہے، تو پلیز! ضد چھوڑ دو۔ اپنی ڈیڈ کی بات مان جاؤ، وہ تم کو بہت چاہتے ہیں۔“

”مام میں کتنی بار منع کر چکا ہوں۔ اگر آپ لوگوں نے زبردستی کرنے کی کوشش کی، تو میں اپنی جان لے لوں گا۔ میں اس سے کبھی شادی نہیں کروں گا۔ کبھی میں اس پلاسٹک کی ڈول کو نہیں اپناؤں گا۔ وہ تو بالکل کسی پلاسٹک کی ڈی لگتی ہے۔“ زین اچھا خاصہ غصے میں آ گیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ زرتاشہ بھی کافی میز پر رکھ کر اٹھ کھڑی ہو گئیں۔ ان کی نگاہوں میں بہت کچھ تھا۔ حیرانی، تعجب، شک، اور کیا کیا نہ تھا، جو دکھائی دے رہا تھا۔

”زین یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ کیا کرنا چاہ رہے ہو؟ تم ہمارا واحد سہارا ہو۔ کبھی سوچا ہے ہمارا کیا ہوگا؟ ہم تو جیتے جی مرجائیں گے۔ میں تو رہ نہیں سکوں گی تمہارے بغیر۔“ زرتاشہ نے اسے دیکھا۔

”مام۔ تو آپ لوگ کیوں میری مرضی کے خلاف جانا چاہتے ہیں۔ آپ لوگ کسی ایسے انسان کو کیوں کسی ایسے انسان کی زندگی میں زبردستی لانا چاہتے ہیں۔ جو اسے پسند نہیں کرتا ہے۔ جو اس کا نام سننا پسند نہیں کرتا ہے۔ آپ لوگ کیوں میری زندگی جیتے جی جہنم بنانا چاہتے ہیں۔ اور اگر میری ماہ نور سے شادی ہو بھی جاتی ہے، تو وہ اگلے دن مجھے آپ لوگوں سے جدا کر دے گی، وہ تو اپنے باپ کی نہیں مانتی ہے، تو میری کیا مانے گی۔“ زرتاشہ بالکل سیدھی ہو گئیں، وہ اسے دیکھتی رہیں۔

”زین۔ قسم سے میں ایسا کچھ بھی نہیں چاہتی۔ میں تمہاری خوشی چاہتی ہوں۔ مگر تمہارے ڈیڈ کی خواہش تھی، وہی بتا رہی تھی۔ تم بے فکر ہو جاؤ۔ تم پر اب کبھی بھی زبردستی نہیں کی جائے گی۔ ہم ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ مگر تمہارے ڈیڈ بس اپنا فائدہ دیکھ رہے ہیں۔“ زرتاشہ ڈھیلی پڑ گئیں۔

”مام ڈیڈ کو سمجھا دیجیے گا۔ میں کسی سے فی الحال شادی کرنا نہیں چاہتا ہے۔ میں اپنی مرضی سے جب

چاہوں گا شادی کر لوں گا۔ یہ میری زندگی ہے۔ مجھے گزارنی ہے۔ ڈیڈ کو نہیں۔“ زین نے مام کو سنایا اور لمبے قدم لیتا ہوا باہر نکل گیا۔ وہاں لاؤنج میں ابرار احمد کھڑے تھے۔ وہ سب سن چکے تھے، ان کے منہ کے زاویے بگڑ گئے تھے۔ وہ سوچ رہے تھے۔

”اس منحوس لڑکی سوہا کا نام ابھی تک اس کے ذہن سے نہیں نکل سکا ہے۔ حالانکہ اسے اس کی زندگی سے نکال باہر کر کے سال ہونے کو آ رہا ہے۔ مگر یہ لڑکا تو کچھ سننے کو تیار ہی نہیں ہے۔ اب پھر مجھے کچھ سوچنا پڑے گا۔ کچھ ایسا کرنا ہوگا کہ سانپ بھی مرجائے، اور لاشی بھی نہ ٹوٹے۔ مجھے ماہ نور کا سہارا لینا ہی ہوگا۔“ وہ زہر خند ہو کر مسکرائے۔ اور زرتاشہ کی طرف قدم بڑھانے لگے۔

☆.....☆.....☆

رات کا اندھیرا ہر سو پھیل چکا تھا، آج رات ڈاکٹر عاشر نے اپنی شفٹ جان بوجھ کر نائٹ کر والی تھی، وہ جب سے سوہا سے ملا تھا، اس پر عجیب سی بے چینی چھائی ہوئی تھی۔ وہ پل پل جیسے سلگ سا رہا تھا۔ اس کا دل سوہا کو دیکھنے کے لیے ہمت کا جاتا تھا۔ جیسے ہی رات کے دو بجے کا وقت ہوا، وہ بے چینی سے اپنے آفس سے باہر نکل آیا۔ ہر طرف ہوکا عالم تھا۔ وہاں عموماً اس ناٹم کچھ زریں ہوتی تھیں۔ مگر رات کے دو بجے کچھ خاص نہیں تھا۔ سارے پرائیویٹس روم خالی تھے اور اس وقت کوئی اور ڈاکٹر بھی نہیں تھا۔ بس ایک چوکیدار تھا، وہ باہر تھا۔ شاہ زرا اپنے بچوں، زوہا، آشان، کا شان کو لے کر گھر چلے گئے تھے۔ اور روہا سوہا کے ساتھ روم میں اکیلی رہ گئی تھی، شاید وہ سوچتی تھی، ڈاکٹر عاشر چلتا ہوا، اسی روم کی طرف چلا جا رہا تھا۔ اب وہ دروازے پر کھڑا تھا۔ اس نے ہینڈل گھمایا، تو وہ بند تھا۔ وہ اب واپس ہوا اور اپنے روم کی طرف جانے لگا۔ اس کی جیب میں اپنا موبائل تھا۔ کوئی ایمر جنسی نہیں تھی۔ ابھی وہ رک کر سوچ رہا تھا۔ اب وہ ماسٹر کی ڈھونڈ رہا تھا۔ وہاں ماسٹر کی پرائیویٹس روم کے لیے الگ رکھی ہوئی تھی، یہ

ابرار احمد اپنے موبائل میں ماہ نور کا نمبر ڈھونڈ رہے تھے۔ اور پھر نمبر انہیں مل گیا۔ ان کی ساری بے چاریاں جیسے ختم ہو گئیں۔ انہوں نے نمبر ملایا۔ کچھ دیر رنگ جانی رہی، پھر دوسری طرف سے شاید ماہ نور نے کال پک کر لی تھی۔

”ہیلو انکل ابرار۔۔۔!! آپ نے اتنے دنوں بعد کیسے یاد کر لیا۔ خیریت تو ہے ناں!!“ ماہ نور کی ہشاش بشاش آواز ان کے کانوں میں سنائی دی۔

”ماہ نور۔۔۔!! آپ سے مجھے ضروری کام ہے؟ کب تک مل سکتی ہو؟“ ابرار احمد نے پوچھا۔

”انکل۔۔۔!! جب آپ کہیں۔!! میں آجاتی ہوں۔“ ماہ نور نے کہا۔

”او کے بیٹا میں تمہیں میسج پر ٹائم بتا دوں گا۔“ جی انکل۔ آپ بے فکر رہیں۔ میں فوراً مل لوں گی۔ ویسے انکل، کیا کام تھا؟“ ماہ نور کے لہجے میں صاف تجسس محسوس کیا جا سکتا تھا۔

”کام بہت ضروری ہے اور میرے خیال میں تمہارے تعاون کے بنا ممکن ہو ہی نہیں سکتا ہے۔“ ابرار احمد نے پراسرار لہجے میں اسے بتایا۔

”ہاں ٹھیک ہے۔ آپ وقت بتانا تو میں ملنے آ جاؤں گی۔“

پھر ابرار احمد نے رابطہ منقطع کر دیا۔ اب وہ مسکرا رہے تھے۔

”کچھ پانے کے لیے کچھ کھانا تو بڑتا ہی ہے۔ اب اس جنگ میں میرے ساتھ ماہ نور بھی ہوگی۔ وہ میرا سب سے خاص مہر ہوگی۔ وہی میری جیت کا سبب بن سکتی ہے۔ صرف وہی۔ ہاں۔ صرف اور صرف اب وہی سارا کھیل پلٹ سکتی ہے۔“ ابرار نے موبائل جیب میں رکھ لیا۔ اب وہ بے چینی سے ادھر ادھر ٹہل رہا تھا۔ اور اس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ تھی۔

☆.....☆.....☆

صبح ماہ نور بڑی بے صبری سے گاڑی میں بیٹھ کر ابرار احمد سے ملنے جا رہی تھی، ابھی انہوں نے ابرار احمد کا میسج

ایمر جنسی کے لیے تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ماسٹر کی اٹھائی، اور آہستہ قدموں سے روم کی طرف جانا شروع کر دیا۔ اب اس نے آہستہ سے ماسٹر کی لاک میں گھمایا۔ دروازے کا پینڈل اس نے جوئی گھمایا، وہ کھل گیا۔ اب وہ آرام سے انٹر ہو گیا۔ اب وہ آہستہ سے چلتا ہوا اینڈ کے سر ہانے کھڑا تھا۔ سوہا کا خوب رو چہرہ اب بہت آرام سے دیکھ رہا تھا۔ نئی دیر وہ گلاب کی مہک سے خود کو مہکاتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ اس نے اپنا چہرہ سوہا پر بھکایا اور اپنے آنسو اس کے چہرے پر گرادیے۔ اسے لگا تھا، وہ اب اچھی جاگ جائے گی مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ وہ کتنی دیر بے یقینی سے سوہا کو دیکھتا رہا۔

”سوہا اٹھ جاؤ۔۔۔!!“ اس نے سوہا کو ہلکا سا ہلایا، مگر وہ ٹس سے مس تک نہ ہوئی۔ اچانک اس کی نگاہیں سوہا کے ساتھ جڑی روہا پر مرکب ہو گئی۔ وہ باہر آیا، دروازہ بند کر دیا، وہ اب واپس جا رہا تھا۔ اس کے آنسو شاید ضائع ہو گئے تھے۔ کچھ بھی نہیں ہو سکا تھا۔ وہ سمجھتا تھا، شاید میرے آنسو سوہا کو اس جادوئی نیند سے جگا دیں گے۔ مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔ وہ حیران سا واپس باہر آیا۔ اب اس کا رخ اپنے آفس کی طرف تھا۔ وہ وہاں بیٹھا ہوا بہت کچھ سوچ رہا تھا۔ مگر اس بار اس کی سوچ کے زاویے منفی تھے۔ اس نے ایک اور کہانی بھی سنی تھی، جس میں ایک شہزادی بالکل ایسی ہی نیند میں گم ہوتی ہے۔ اب ڈاکٹر عاشر بن رہا تھا۔

”اس لڑکی کے پیچھے ایک شیطان آ جاتا ہے۔ اور حسین شہزادے کا روپ دھار کر اسے نیند سے جگا دیتا ہے۔“ ڈاکٹر عاشر سوچ رہا تھا۔

”ہر انسان کے اندر ایک شیطان چھپا ہوتا ہے۔“ ڈاکٹر عاشر کے ہونٹوں پر بڑی جان لیوا سی مسکراہٹ تھی۔

”سوہا کو جگانے کا وقت آ گیا ہے۔“ ڈاکٹر عاشر کی آنکھیں بھی مسکرائیں تھیں۔

☆.....☆.....☆

مسکراہٹ ہونوں پر سجا کر بولی۔

”وہ تھرڈ کلاس پھنچری لڑکی میں ایک سال پہلے ہی اس کی زندگی سے باہر نکال چکا ہوں۔ وہ بس اسے ڈھونڈ رہا ہے۔ مگر وہ اس تک بھی نہیں پہنچ پائے گا۔ میں تمہاری جگہ کسی اور کو کبھی نہیں دے سکتا۔ بھی ایسا نہیں ہو سکتا ہے۔“ ابراہام اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”انکل تو جب آپ اس لڑکی کو سال پہلے اس کی زندگی سے نکال کر پھینک چکے ہیں۔ تو اتنے عرصے تک میرا خیال پہلے کیوں نہیں آیا۔ اب تو بہت کچھ میری زندگی میں تبدیل ہو چکا ہے۔ بہت سارے لوگ آکر جا چکے ہیں، پہلے تو میں بھی ایسا ہی سوچا کرتی تھی۔“ ماہ نور کو انکل ابراہام کی بات پر کوئی یقین ہی نہیں آیا۔

”کیونکہ میں اور زرتاشہ اسے تمہارے لیے اپنے طور پر مرنے لگے تھے۔ مگر اس نے ہماری ایک نہ مانی، اور شوبز بس میں انٹری دے دی۔ پھر مجھے یہ دھڑکا بھی لگا رہنے لگا کہ تمہارا باپ ایک شو بزنس سے جڑا داماد قبول نہیں کرے گا۔ کیونکہ زین کو جتنی کامیابیاں ملیں، اتنے وقت کے ساتھ ساتھ اس کے جھوٹے افیئر ز شہور ہو گئے۔ وہ سب جھوٹ تھا۔ زین صرف سوہا کو ڈھونڈنا رہا ہے۔ مگر وہ اسے کبھی نہیں ملی۔ اور نہ وہ زین کو کبھی مل سکتی ہے۔“

”انکل!! تو اب آپ کیا چاہتے ہیں۔ میں اس سلسلے میں کیا مدد کر سکتی ہوں۔ زین تو میرے ہاتھ آنے سے رہا۔ اس کے ان جھوٹے افیئر ز کی خبروں نے مجھے بالکل توڑ کر رکھ دیا ہے۔ میں بھی افیئر ز چلاتی رہی ہوں۔ مگر وہ سب سچ تھے۔“ ماہ نور اب بات کا اختتام چاہتا تھا۔

”بیٹا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم بھی زین کے ساتھ کچھ ایسا کرو کہ وہ تمہارے آگے بے بس ہو جائے۔ کچھ اس کی کمزوری پکڑو۔ میں جانتا ہوں۔ یہ میرے لیے بہت مشکل ہے۔ مگر اس مشکل کو ختم کرنے کے لیے ہم نے کڑوا گھونٹ تو پینا ہی پڑے گا۔“ ابراہام نے کہا تو ماہ نور جو کھڑی ہو گئی تھی، وہ واپس بیٹھ گئی۔

دیکھ لیا تھا۔ وہ رات بھر بے چین سی رہی۔ اس کی آنکھوں میں، عجیب سی بے چینی تھی۔ جو بڑی صاف نظر آ رہی تھی۔ اس کی گاڑی بہت تیزی سے جا رہی تھی۔ اس نے ابراہام کے آفس کے سامنے کار پارک کر دی اور تیزی سے عمارت میں داخل ہو گئی، اب وہ لفٹ میں اوپر جا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ ابراہام کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی، وہ بے چینی سے ٹیبل پر بڑا ہوا ویٹ پیپر گھما رہے تھے۔ ان کی آنکھوں کی مکاری چہرے پر واضح ہو رہی تھی۔ مگر دونوں میں ابھی تک صرف سلام کلام ہی ہوا تھا۔

”انکل کیا سوچ رہے ہیں؟“ ماہ نور نے بے چینی سے اسے دیکھا۔

”بیٹا مجھے لگتا ہے۔ میں جو سوچ رہا ہوں۔ وہ تمہارے بھلے کے لیے ہے۔ کیا تم میرا ساتھ دے سکتی ہو؟“

”انکل کیا کام ہے؟ جو میرے بغیر ممکن ہی نہیں ہے؟“ ماہ نور نے ابراہام کو بغور دیکھا۔

”مجھے ایسا لگتا ہے کہ تم زین کو پسند کرتی ہو اور میں چاہتا ہوں۔ تم میری بہو بن جاؤ۔“ ابراہام نے کہا تو وہ انکل ابراہام کو دیکھتی رہی، پھر وہ ہنسی۔

”انکل، آپ کے یا میرے چاہنے سے کیا ہوگا؟ اختیار تو زین کو ہے۔ اور وہ مجھے بالکل بھی پسند نہیں کرتا ہے۔ تو آپ یہ بزر باغ مجھے کیوں دکھا رہے ہیں۔ اور جو انسان کسی کا نام سننا پسند نہیں کرتا ہے، آپ مجھے اسی انسان کی بیوی بنانا چاہتے ہیں۔“

”تم نے سنا تو ہوگا۔ اگر کوشش مسلسل کی جائے، تو منزل مل ہی جاتی ہے۔ ہم بھی لاسٹ ٹرائی کر ہی لیتے ہیں۔“ ابراہام نے اپنی آنکھیں اچھی خاصی بڑی کر دیں۔

”ہاں۔ سنا ہے۔ مگر مجھے اپنے آپ پر یہ مقولہ درست نہیں لگ رہا ہے۔ زین کسی لڑکی میں انوالڈ ہے۔ اور وہ اسے کبھی نہیں چھوڑے گا۔ چاہے اس کے لیے آپ کتنے ہی پاؤں کیوں نہ بیلیں۔“ ماہ نور نے طنز یہ

”ہاں اگر آپ نے کچھ سوچا ہے، تو کھل کر بتائیں۔ ویسے بھی ہم ایلٹ کلاس سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہائے فائے، سوسائٹی میں موو کرتے ہیں۔ میں برا نہیں مانوں گی۔ آپ مجھ سے کیا کروانا چاہتے ہیں؟“ ماہ نور نے کہا تو ابرار احمد نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسا لیں۔ جیسے وہ شش و پنج کا شکار ہوں۔

”کچھ خاص نہیں۔ تم زین کا شو بزنس کیئر ڈسٹرائے کر دو۔ اور اس کو مجبور کر دو۔ کچھ ایسی بدنامی، رسوائی اس کے دامن سے جوڑ دو کہ وہ بس تمہارا ہو کر رہ جائے۔ اسے اغوا کروادو۔ اس کو بے ہوش کر کر اس کی کچھ ایسی پرائیویٹ تصویریں لیک کر دو کہ لوگ اس پر تھو تھو کریں، کسی دوسرے کی کال گرل کے ساتھ اس کی ایسی ویڈیو بناؤ۔ جو لوگ دیکھیں، تو اس پر تھو کنا پسند نہ کریں اور وہ منہ چھپاتا پھرتا رہے۔ پھر میں تمہاری شادی اس سے کروا دوں گا۔ اس کو تم جذباتی سہارا دو گی۔ وہ بدکردار نہیں ہے۔ ہیرا ہے، مگر کچھ کرنے کے لیے تو اسے بدنام کرنا ہی پڑے گا، وہ صرف محبت میں اندھا ہو گیا ہے، تم جانتی تو ہو۔ تمہارا جذباتی سہارا اسے سب کچھ بھلا دے گا۔ میں شادی کے بعد تم دونوں کو ابراؤ بھیج دوں گا۔ اور سب ٹھیک ہونے کے بعد ہم اسے کبھی نہیں بتائیں گے کہ یہ سب ہم نے پلان سے کیا تھا۔“ ابرار احمد نے ماہ نور سے جو کہا، ماہ نور کی آنکھیں حیرانگی سے پھیلتی چلی گئیں۔

”انکل، ویٹ!! آپ کیا سمجھ رہے ہیں۔ میں یہ سب کچھ کروں گی، اور اس کی کیا گارنٹی ہوگی کہ زین میرا ہو جائے گا اور زین میرے بارے میں کیوں سوچے گا، آپ انتقام میں اتنے گر سکتے ہیں کہ اپنے ہی بیٹے کو بدنام کرنا چاہ رہے ہیں، میرے ڈیڈ بھی نہیں مانیں گے۔ وہ کیونکر مان سکیں گے، ایک ایسے شخص کو اپنا داماد کیوں بنانا چاہیں گے۔ جس کا دامن بچھڑے بھر دیا گیا ہو۔ بھلے ہی زین بے گناہ ہو۔ بھلے ہی وہ میری وجہ سے ایسا بدنام ہوا ہو۔ مگر میں ایک بدنام زمانہ انسان کے ساتھ کیوں رہنا چاہوں گی، اس سوسائٹی جس میں ہم

رہتے ہیں۔ وہاں اللہ کی پرواہ تو ہم نہیں کرتے ہیں، مگر انسانوں کی پرواہ ضرور کرتے ہیں۔ بھلے ہم اندر سے کتنے مکار، دھوکے باز، دوغلے، جھوٹے، غدار، کیوں نہ ہوں۔ مگر ہم اپنا ظاہر صاف، شفاف دکھاتے ہیں۔ ہم اندر سے کتنے کمزور، ٹوٹے ہوئے کیوں نہ ہو، مگر ہمیشہ اپنے ہونٹوں پر مسکان سجاتے ہیں، ابرار انکل سوری، مجھے زین کی ایسی ناپاک محبت نہیں چاہیے، ہاں اگر وہ بدکردار ہو، مگر ظاہر نہ ہو۔ چھپا ہوا ہو، تو میں پھر بھی اس کا ساتھ قبول کر لوں گی۔ کیونکہ ہم سب ایسے ہیں۔ میں کوئی وہ لڑکی نہیں ہوں، جو پاک دامن، باحیا، باکردار، پردے والی، شرمساری ہوں۔ مگر میں چھپی ہوں۔ میرا ظاہر باکردار، باحیا اور عزت سے بھر پور ہے۔ مگر باطن آپ اور اپنے خاندان کی طرح گندا ہے۔ جب زین نے مجھے ٹھکرایا، تو کیا میں ساری زندگی زین کا انتظار کرتی؟ نہیں اس کے اگلے دن ہی میرا اپنا پکڑ شروع ہو گیا تھا۔ بہت بڑے سیاست دان کے بیٹے شان غوری کے ساتھ، وہ ڈرگ ایڈ تھا، میں بھی ہو گئی، میں ڈرگ ایڈ تھا ہو گئی ہوں۔ شیشے کیسے جاتی ہوں، ڈانس کرتی ہوں اور سونگ میں تو کمال کر دیتی ہوں۔ ہم بنا شادی کے ہیوج برنجر (فنی مومن) پر گئے ہیں۔

برطانیہ میں اس کے ساتھ ہالی ڈیز منانے جاتی رہی ہوں یہ سب صرف اس لیے بتا رہی ہوں کہ آپ سمجھ جائیں کہ عزت کتنا بڑا مرتبہ ہوتا ہے۔ میں پرنکلیٹ ہو گئی تھی۔ میرے ڈیڈ نے عزت کو چھپانے کے لیے میرا مس کیرج کرادیا۔ مگر عزت پر دھبا نہیں لگوا یا۔ انکل آپ کرسی کے لیے، ایک سیاست دان خاندان کا نام و مرتبہ حاصل کرنے کے لیے، اپنے بیٹے کو زندہ درگور کرنا چاہتے ہیں۔ آئی ایم ویری دس آپائنٹ۔۔۔!!“ ماہ نور اٹھی، اس نے ابرار کو دیکھا، اور وہاں سے جانے لگی۔ ابرار دھواں دھواں چہرے سے اسے دیکھتے رہے۔

”ماہ نور۔۔۔!!“ ابرار احمد نے اسے آواز دی۔ وہ مڑی، اور دروازے پر سے واپس آئی۔

”میں پھر بھی تمہیں اپنی بہو بنانا چاہتا ہوں۔۔۔!! مجھے پتہ ہے، تم ایسی ہو۔ کیونکہ تمہارے باپ کے کردار کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔“ ابراہیم نے اسے دیکھا۔

اس پودے پر تین گلاب کے بڑے پھول تھے، جس میں آگ دہک اٹھی تھی اور تینوں گلاب کے پھولوں میں سوبا کا عکس نظر آ رہا تھا۔ اس نے ایک پھول توڑنا چاہا۔ مگر اسے کرنٹ لگا۔ وہ نہیں توڑ سکا۔ وہ وہاں بیٹھ گیا، وہاں سڑک کنارے ایک گاڑی میں نوری اور سانول بیٹھے ہوئے زین کو دیکھ رہے تھے۔ وہ مبینوں سے یہاں آتے رہے تھے۔ ان کا روز کا تجسس ان کو یہاں کھینچ کر لے آتا تھا، وہ جلتے گلاب کو دیکھ کر خوش ہو جاتے تھے۔ ان کا کام یہی تھا۔ ابراہیم احمد اسے اسی بات کی تنخواہ دیتے تھے۔ جو جلتے گلاب کا پھول ان لوگوں نے اس میدان میں بویا تھا۔ وہ کسی کو نظر نہیں آ سکتا تھا۔ سوائے ان کے جنہوں نے یہ کام کروایا تھا، یا پھر زین کو، کیونکہ زین سوبہ سے محبت کرتا تھا۔ اور یہ بات شروع سے بڑے سرکار نے ان کو سمجھائی تھی۔ اس لڑکی کا محبوب اگر یہ پودا دیکھے گا، تو اسے نظر آئے گا۔ اور وہی ہوا تھا۔

نوری اور سانول نے زین کو جلتے گلاب کا پودا دیکھتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ اب زین کا جانے کا انتظار کر رہے تھے، زین کتنی دیر تک اس جلتے گلاب کے پودے کے پاس دکا رہا۔ شاید اس سے باتیں کر رہا تھا۔ پھر اس نے ویڈیو بنائی، اور اب وہ واپس سڑک کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے موبائل پر ابراہیم احمد کا فون آیا تھا۔ جیسے ہی وہ میدان سے نکل کر باہر گیا۔ ان دونوں کی جان میں جان آئی۔

☆.....☆.....☆

نوری اور سانول نے ایک دوسرے کو معنی خیزی سے دیکھنا شروع کر دیا۔ نوری نے موبائل نکال کر ابراہیم احمد کا نمبر ڈائل کر دیا۔ کچھ دیر تیل جاتی رہی، پھر ابراہیم احمد نے نمبر پک کر لیا۔

”اب میں آپ کی بہو بنانے چاہتی۔ آپ کا بیٹا عاشق نہیں، اس لڑکی کا مریض بن چکا ہے۔ انکل!! اسے جدامت کریں۔ مرجائے گا۔ میں لاسٹ ٹائم زین سے ملی تھی۔ وہ تب رمشال کے ساتھ شوٹ کر رہا تھا۔ اور اس کے کندھے پر سر رکھ کر اس لڑکی کے لیے جو آپ نے اس سے پہنچی ہے۔ بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ رمشال شاہ، اس دن خود بھی روئی تھی، میں بھی اس ڈرامے کی شوٹ سے روئی ہوئی واپس آ گئی تھی، مگر انکل آپ اتنے پتھریل ہو گئے۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ میں آپ کا راز زین کو نہیں بتاؤں گی، مگر یاد رکھیے گا۔ آپ نے اگر میرے بارے میں کسی سے زبان کھول دی۔ تو کوئی یقین نہیں کرے گا۔ مگر میں میرا یقین کر لے گا۔“ ماہ نور نے ان کو دیکھا اور مزید انداز میں ان پر نگاہیں مرکوز کر کے چلی گئی۔ وہ دھواں دھواں سے ہو رہے تھے۔

”نو، نیور۔۔۔!! میں کبھی بھی شکست نہیں مانوں گا۔۔۔!!“ ابراہیم احمد نے ہوا میں مکا لہرایا۔

☆.....☆.....☆

ایک سال گزرنے کے بعد۔

زین کا ذل جب کبھی تنگ ہوتا تو وہ رات کے وقت آوارہ گردی کرنے اکثر باہر جاتا رہتا۔ اب تو وہ ٹائٹ کنسرٹ بھی کرنے لگا تھا، اور ابراہیم احمد کو بدغصہ آتا رہتا۔ بظاہر تو اس کے مام ڈیڈ نے ماہ نور سے اس کا رشتہ کرنے کا ذکر ترک کر دیا تھا۔ مگر اسے لگتا تھا، ڈیڈ اس سے کبھی بھی خوش نہیں ہونے والے ہیں۔ اب اس نے سوبا کے محلے میں جانا چھوڑ دیا تھا۔ وہ کیسے جاتا، اتنا مشہور ہونے کے بعد تو جیسے وہاں بھیڑ لگ جاتی تھی اور اسے بھیڑ سے کوفت ہوتی تھی۔ وہ سوبا کو ابھی تک تلاش کر رہا تھا۔ مگر اسے ہر جگہ ناکامی مل رہی تھی۔ رات کو وہ

وہاں وہ لوگ جنگلی جھاڑیاں ڈال کر چلے گئے تھے۔ اب ان کا رخ گاڑی کی طرف تھا۔ دونوں نے گیلے کے کنڈوں کو دائیں سے بائیں پکڑ رکھا تھا۔ اگر کوئی دیکھ لیتا، تو وہ ایسا محسوس کرتا، جیسے ان دونوں نے صرف خالی گلاب پکڑ رکھا ہے۔ کیونکہ اب پھول نظر نہیں آ سکتا تھا۔ گاڑی میں جلتے گلاب کا پودا ڈال کر وہ دونوں سیٹ پر آ کر بیٹھ گئے۔ اب ان کی گاڑی ہائی وے سے اچھی خاصی دور جا رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

اگلے دن زین جیسے ہی اٹھا تو اس نے سب سے پہلے اسی میدان میں جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ وہاں پہنچا تو اسے حیرانی ہوئی، وہ عجیب سے وہم میں پڑ گیا۔ رات کو جلتے گلاب کا پودا دکھائی دیا تھا، مگر اب وہ وہاں نہیں تھا، وہ کچھ دیر وہاں اس جگہ کو ڈھونڈتا رہا۔ پھر اسے وہ جگہ مل گئی، جہاں جلتے گلاب کا پودا اسے نظر آیا تھا۔ اب وہاں ایک اچھا خاصا گڑا تھا، جس پر کسی نے جنگلی میدان کی کانٹے دار جھاڑیاں ڈال رکھی تھیں۔ وہ وہاں زمین پر غم سے بیٹھ گیا، کتنی دیر تک وہ بے یقینی سے خود بے باتیں کرتا رہا۔ پھر جانے کتنی دیر بعد اسے ڈائریکٹر اکرام اللہ خان کی کال آئی، آج زین کی شونگ تھی، اور وہ اس دیرانیے میں بیٹھا سسک رہا تھا۔ وہ اٹھا اور جانے لگا۔ اب وہ اسٹوڈیو جا رہا تھا۔ وہ جیسے ہی شوٹ پر پہنچا، تو رمشاں شاہ منہ بنا کر کھنکھناتی ہوئی تھی۔ اس نے اس سے کچھ دیر بات کی۔ پھر ان کی ڈرامے کی آخری قسط کی شونگ شروع ہو گئی۔ شونگ کے بعد وہ ڈائریکٹر اور پوری ٹیم ایک چھوٹی سی گیڈ نو گیدر کرنا چاہ رہے تھے، اس نے دل کا غم کسی پر ظاہر تک نہ ہونے دیا، اور گیڈ نو گیدر سے معذرت کرتا ہوا گھر آ گیا، مگر اسے میں بند ہو کر وہ کتنی دیر تک سوہا کا بنایا ویڈیو کلپ دیکھتا رہا۔ اس نے سینکڑوں بار، اس ویڈیو کو دیکھا تھا۔ اسے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ جانے کب سو گیا۔ موبائل اس کے سینے پر رکھا ہوا تھا۔

☆.....☆.....☆

”ہیلو نوری! جیسے یاد کر لیا۔ میں نے تم لوگوں سے ڈسٹرب نہ کرنے کو کہا تھا۔“ ابرار احمد ابھی تک ماہ نور کی باتوں پر شدید غصے میں تھے۔  
 ”سائیں۔۔۔!! ابھی ابھی زین بابا نے جلتے گلاب کا پودا دیکھ لیا ہے۔ ابھی ابھی وہ میدان سے نکل کر گھر کی طرف جا رہے ہیں۔“ نوری نے ابرار احمد کو آنے والے خطرے سے پہلے ہی خبردار کر لیا۔  
 ”کیا؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ وہ کیسے اس ویران اجاڑ میدان میں چلا گیا۔۔۔!! یہ سب کیسے ہوا؟ تم دونوں نے اسے روکا کیوں نہیں، کیا نہیں مر گئے تھے؟“ ابرار احمد کی آواز میں غراہٹ تھی۔  
 ”سائیں۔ ہم کو کچھ پتہ نہیں چل رہا ہے، ہم نے جو کچھ دیکھا آپ کو وہی بتا دیا ہے۔ اب آپ بتائیں۔ ہم آگے کیا کریں؟ ہمارے لیے حکم کیا ہے؟“  
 ”تم دونوں جلتے گلاب کو وہاں سے باہر نکال دو اور اپنے ساتھ گھر لے جاؤ۔ ہم کل اس کے لیے کچھ سوچتے ہیں۔۔۔!!“ ابرار احمد اچھے خاصے غصے میں تھے۔ نوری نے اچھا کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔  
 ”سانول۔۔۔!! ہمیں یہ جلتے گلاب کا پودا اب یہاں سے نکالنا ہوگا۔!! سائیں نے حکم دے دیا ہے۔!!“ نوری نے سانول سے کہا۔  
 ”تو اس میں کیا ہے! ابھی نکال لیتے ہیں۔“ وہ دونوں میدان کی طرف جانے لگے۔ انہوں نے گاڑی سے بیچے، اور پھاڑے نکال لیے تھے، اب وہ میدان میں کھدائی کر رہے تھے۔ دونوں جنگلی کانٹے دار پتوں سے کچھ نہ کچھ زخمی بھی ہو گئے تھے۔ جس سے ان کے ہاتھ زخمی بھی ہو گئے تھے۔ اور خون کے کچھ قطرے گر گئے تھے۔  
 ”تم جاؤ۔!! گاڑی سے وہ بڑا گلاب نکال کر لے آؤ۔!!“ سانول نے نوری سے کہا، نوری چلا گیا، اب اس نے کندھے پر اچھا خاصا بڑا گلاب اٹھا رکھا تھا۔ اب وہ دونوں جلتے گلاب کا پودا، گیلے میں رکھ کر مٹی ڈال رہے تھے۔ جس جگہ سے گلاب کا پودا نکالا تھا۔ اب



”نہیں، بیٹا، دراصل یہ عجیب سی بات ہے۔ جب سے میری بیٹی کو سے میں گئی ہے۔ اس کے وجود سے گلاب کے پھولوں کی مہک محسوس ہوتی ہے۔ مجھے نہیں پتہ ہے۔ یہ کیوں ہو رہا ہے۔ مگر شاید یہ بھی کوئی راز ہی ہو۔“ نرس نے اثبات میں سر ہلایا، اور اب وہ سوہا کی فائل میں کچھ لکھنے لگی۔ نرس اب واپس جا رہی تھی۔ شاہ زر دوبارہ صوفے پر اداس سے بیٹھ گئے۔ اور سوہا کو دیکھنے لگے۔

☆.....☆.....☆

ڈاکٹر عاشق اپنے گھر کے شاندار کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اپنے موبائل کی اسکرین آنکھوں کے سامنے کر رکھی تھی اور سوہا کی تصویریں دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بالکل سرخ ہو چکی تھیں۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا۔

”سوہا۔۔۔!! میں تمہیں بہت جلد پالوں گا۔!! آج رات تم میری ہو جاؤ گی۔!! میں سے نہیں اپنے آنسوؤں سے جگانا چاہا۔ مگر تمہاری نیند کچھ زیادہ ہی گہری تھی۔ جب تک تمہارے وجود میں نئی زندگی شامل نہیں ہوگی۔ تم نہیں جاگ سکو گی۔!!“ ڈاکٹر عاشق نے سوہا کی تصویر پر اپنے دونوں ہونٹ رکھ دیے۔ وہ کتنی دیر سے خود کی کیفیت میں سوہا کی تصویر کو چومتا رہا۔ وہ تصور کے عالم میں جیسے سوہا کو چوم رہا تھا، پھر وہ مسکرایا۔ اور سوچنے لگا۔

”سینکڑوں سال پہلے کی بات ہے، ایک شہزادی تھی، جو بہت پیاری تھی، وہ جادوئی نیند کے حصار میں تھی، ملک کے بہت سارے لوگوں نے اس کی جادوئی نیند کو توڑ کرنے کی کوششیں کیں، مگر وہ سب ناکامیاب رہے۔ پھر ایک دن ایک شیطان آیا۔ اس نے شہزادے کا روپ دھار رکھا تھا۔ وہ شہزادی کے پاس اکیلے میں گیا۔ اور اس کو دیکھ کر اس کا عاشق بن بیٹھا۔ اس نے شہزادی کو جگانے کی کوشش شروع کر دی۔ مگر ناکامیاب رہا۔ تب اس نے شہزادی کے جاگنے کا انتظار تک نہیں کیا۔ اور اس سے ہم بستری قائم کر دی۔ شہزادی کے وجود میں کچھ بختے بعد نئی زندگی

روہا کالج جا چکی تھی، اب سوہا کے پاس اسپتال میں صرف شاہ زر ہی رہ گئے تھے، انہوں نے صبح گھر میں بچوں کو ناشیہ کر کر اسکول چھوڑ دیا تھا اور اب اسپتال میں سوہا کے سر ہانے بیٹھے اس کے خوب رو چرے کو دیکھ رہے تھے۔ انہیں کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ بس وہ اللہ سے سوہا کے جلد صحت یابی کے لیے دعائیں کیا کرتے تھے۔ مگر ابھی تک وہ اس امتحان سے باہر نہیں نکل سکے تھے۔

صبح کے وقت ڈاکٹر کم ہی راؤنڈ لگاتے تھے۔ اس وقت جزل چیک اپ ہوتا تھا۔ شاہ زر نے منزل اٹھائی اور پڑھنے لگے۔ وہ کچھ دیر تک تلاوت کرنا چاہ رہے تھے۔ تلاوت کرنے کے بعد انہوں نے سوہا پر پھونک دیا۔

”سوہا۔۔۔!! میری جان کے کٹڑے، اب بہت سولیا ہے۔!! اب جاگ جاؤ۔ ہم سب تمہاری خاطر بہت پریشان ہو گئے ہیں۔ دیکھو، تم کہتی تھی۔ ہم شہر چلے آتے ہیں۔ ہم واپس آگئے ہیں اور جیسے ہی آگئے، تم سو گئی۔ اب مزید مت سونا۔ جاگ جاؤ۔ ورنہ میرا دل پھٹ جائے گا۔“ شاہ زر سوہا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہہ رہا تھا۔

اچانک کمرے کا دروازہ کھلا، اور نرس اندر داخل ہو گئی۔ وہ جیسے ساکت ہو کر رک سی گئی۔ شاہ زر نے نرس کو نم آنکھوں سے دیکھا، نرس مسکرا کر ان کے پاس آ گئی۔

”انکل۔۔۔!! زیادہ پریشانی کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ انشاء اللہ بہت جلد بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔“ نرس نے کہا، اور اپنا کام شروع کر دیا، اب وہ سوہا کا چیک اپ کر رہی تھی۔

”انشاء اللہ۔۔۔!!“ شاہ زر نے دل ہی دل میں کہا۔ اور نرس کو دیکھنے لگے۔

”انکل۔۔۔!! کیا آپ گلاب کی اسپرے کمرے میں کرتے ہیں؟ میں جب بھی آتی ہوں؟ سوہا کے وجود سے گلاب کے پھولوں کی مہک محسوس ہوتی ہے۔۔۔!!“ نرس نے شاہ زر کو دیکھا، اب وہ سوہا کا نمپرچر چیک کر رہی تھی۔

بھی چلی آئی۔ ویسے بھی پرائیویٹ رومز میں اتنا شرس نہیں ہوتا تھا۔

”بابا۔۔۔!! آپ کھانا کھا لیجیے۔!! میں آج رات سوہا کے ساتھ رک جاؤں گی۔!! آپ کھانے کے بعد گھر چلے جائیں۔۔۔!! کا شان، آپ کو بہت مسڈ کر رہے تھے۔“ شاہ زرنے روہا کے سر پر ہاتھ رکھا، اور کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ کچھ نوالے روہا نے ان کا ساتھ دینے کے لیے کھائے۔ انہوں نے روہا کو پیسے دیے اور اسے ہدایت کر دی۔

”بیٹا۔۔۔!! کچھ بھی چاہیے ہو، تو آدھی رات کو فون کر دینا۔ میری نیند اب پچی ہو گئی ہے۔ فوراً جاگ جاؤں گا۔۔۔!!“ روہا ہنس دی۔

شاہ زرنے کہتے ہی روہا خاموش ہو گئی۔ اب وہ ہنس رہی تھی۔ شاہ زرنے اب کھانے کے برتن اٹھا کر اسپتال سے نکل رہے تھے۔ اور اسی وقت پارکنگ میں ڈاکٹر عاشق کی گاڑی رک رہی تھی۔ اس کی ڈیوٹی شروع ہو رہی تھی۔ وہ دن بھر ایک لمحے کو چین سے نہ سو سکا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ بہت بھیاںک خواب دیکھ کر اٹھ گیا تھا، اس نے جاگتے وقت سوہا کو پکارا تھا۔ خواب میں سوہا قبرستان کنارے کھڑی تھی، اور زندگی بچانے کے لیے تگ و دو کر رہی تھی۔ ایک قبر سے جانے کیسے ایک ہاتھ باہر نکل کر آیا تھا، اور اس نے سوہا کو پکڑ لیا تھا۔ سوہا نے چیخ ماری، اور اس ہاتھ کی گرفت سے آزاد ہو گئی، اب وہ قبرستان سے باہر نکلنے کے لیے بھاگ رہی تھی، جیسے ہی وہ زنگ آلود گیٹ کے پاس پہنچ گئی، اس نے دیکھا، ایک کربینہ صورت بیٹھی یا اس کا راستہ روک کے کھڑا تھا۔ سوہا بھاگنے لگی، اور بیٹھی یا اس کے پیچھے اسے پکڑنے کے لیے دوڑ پڑا، جیسے ہی بیٹھی نے اس پر حسرت لگائی، وہ اندھے کنویں میں گر گئی چلی گئی، اس کے منہ سے ایک ہی آواز نکل رہی تھی۔

”زین۔۔۔!! زین۔۔۔!! زین۔۔۔!!“ وہ چیخ رہی تھی، اور زین جب اٹھا، تو اس نے بھی سوہا کا نام

دوڑنے لگی، اور وہ ایسی جالب کئی، اس کی جادوئی نیند کا سار اٹھ گیا۔

ڈاکٹر عاشق نے دل ہی دل میں وہ کہانی مختصر الفاظ میں دہرا دی۔ جو اس نے کافی پہلے سن رکھی تھی، اور ایک کتاب میں پڑھ رکھی تھی۔

”سوہا۔۔۔!! وہ ہماری کہانی تھی، جو سالوں پہلے کسی عقل مند نے لکھی تھی۔ میں سوہا اب تم سے مزید دور نہیں رہوں گا۔ آج کی رات تم میری ماںہوں کے حصار میں ہوگی اور جب تمہارے وجود میں نئی زندگی کی لہر دوڑے گی۔ تو تم جاگ جاؤ گی۔“ وہ مسکرایا۔ ہنسا۔ اور ہنستا رہا۔ مگر وہ کہانی کا کلاکس بھول چکا تھا، جب شہزادی کو پتہ چلا کہ وہ بنا شادی کے امید سے ہو چکی ہے، تو اس نے شیطان کا ساتھ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور جب شیطان اس کو مجبور کرنے لگا، تو اس نے شیطان کے شر سے بچنے کے لیے خودکشی کر لی۔ شہزادی شیطان کو کبھی نہیں ملی۔ اور وہ بھول بیٹھا تھا، شہزادیاں شیطانوں کو کبھی نہیں ملتی ہیں۔

”ہر انسان جو بظاہر اچھا ہوتا ہے، بااخلاق ہوتا ہے، مگر شیطان اسے بہکانے کے لئے اس کے پیچھے لگا رہتا ہے، اور وہ شیطان، موقع کی انتظار میں رہتا ہے۔ جب وہ موقع اسے میسر آ جاتا ہے، تو وہ شیطان انسان پر قابو پا لیتا ہے۔“ ڈاکٹر عاشق خمار آلود آنکھوں سے ابھی تک سوہا کی کوسے میں لی گئی تصویر کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا ذہن ابھی بہت کچھ سوچ رہا تھا۔ وہ منصوبہ بنا رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

رات تک روہا اسپتال آچکی تھی، وہ شام تک گھر میں بہن بھائیوں کے ساتھ رکی رہی تھی، گھر کے سارے کام کاج سے فارغ ہو کر اب وہ شاہ زرنے کے لیے کھانا لایا تھی، بہن بھائیوں کو وہ کھلا بچکی تھی، اور کسی کو بھی گھر میں گھسنے نہ دینے کی واضح ہدایات آدھے گھنٹے تک دیتی رہی تھی، شاہ زرنے اسے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ انہوں نے آج روہا کو منع بھی کر دیا تھا۔ مگر وہ پھر

اپنے کار سے پستول نکل کر بلٹ میں اڑس لیا۔ اب وہ کسی بھی حال میں سوہا کو بچانا چاہتا تھا۔ ان سے جلتے گلاب کا پودا چھین لینا چاہتا تھا۔ اور اسے زمین میں دبا کر سوہا کو اس حال سے نجات دلانا چاہتا تھا۔

☆.....☆.....☆

ماہ نور، شیشے کے کینے میں بیٹھی ہوئی تھی اور شیشہ پی رہی تھی۔ اس کا ذہن ابرار احمد کی باتوں میں اٹکا ہوا تھا۔ مگر وہ ان کی آفر رد کر چکی تھی۔ اس نے شیشہ اٹھا کر منہ سے لگایا۔ اور اس کا دھواں اندر اتار لیا۔ اب وہ دھواں منہ کے ذریعے باہر نکال رہی تھی۔ اور دھوئیں سے گول گول رنگ بن رہے تھے۔ جو ماحول کو دلفریب بنا رہے تھے۔

”ایڈیٹ۔۔۔!! چیف، راسکل، بلڈی ابرار احمد، جو اپنے سکے بیٹے کا نہ ہو سکا۔ وہ میرا کیا ہو جاتا۔ اس گریڈی کو میرے باپ کی طرح شہرت چاہیے۔ سیاست میں اس کا کوئی نام نہیں ہے۔ وہ شہرت کا بھوکا، اپنے نام کے لیے مجھے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ ساری زندگی مجھے لوگ استعمال کرتے رہے۔ دھوکے دیتے رہے۔ ہر کوئی اپنے مطلب کے غرض سے ملا۔ واقعی کسی نے سچ ہی کہا ہے۔ پرواہ کرنی ہے، تو قدر کرنے والوں کی کرو۔ استعمال کرنے والے تو خود خود آپ کو ڈھونڈ ہی لیتے ہیں۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ شاید رو رہی تھی۔ اچانک کوئی ایک دم سے اس کے سامنے والے سیٹ پر آ بیٹھا تھا۔ اس کے منہ سے شیشے کے دھوئیں نکل رہے تھے۔ جو دل کے شکل میں تھے۔ اور نفا میں تحلیل ہو رہے تھے۔ ماہ نور نے اسے زخمی نظروں سے دیکھا۔ وہ اسے دیکھ کر ہنس رہا تھا۔

”ہائے۔۔۔!! میں روز۔۔۔!! پورا نام شمر روز۔۔۔!!“ اس ماڈرن لڑکے نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ کوئی فٹنس ماڈل لگ رہا تھا۔ اس کے ابرو میں بھی کٹ لگا تھا، کان میں ٹائپس تھا۔ ہاتھ پر ٹیٹو کا نشان بہت واضح تھا۔

”سوری۔۔۔!! میں نے آپ کو پہچانا نہیں،

پکارا تھا، وہ بے چین ہوا اٹھا تھا، اب وہ گھر سے باہر جا رہا تھا۔ اس کے پسینے بہہ رہے تھے۔ اچانک اس نے باہر ابرار احمد کو دیکھا، وہ پریشانی سے ادھر ادھر ٹہل رہے تھے۔

”ڈیڈ۔۔۔!! رات کے اس پہر کیا کر رہے ہیں؟“ وہ ٹھک کر اپنی جگہ رک گیا۔ ابرار احمد کچھ دیر فون پر بات کرتے رہے۔ پھر وہ گیراج کی طرف چلے گئے۔ اب وہ گاڑی باہر نکال رہے تھے۔ زمین کو لگا، ڈیڈ پریشان ہیں۔ اس لیے اپنی پریشانی اس کے ساتھ شیئر نہیں کرنا چاہتے ہیں۔

”مجھے ڈیڈ کی ہیلپ کرنی چاہیے۔ ضرور کوئی ایمر جنسی ہوگی۔ ورنہ رات کے اس پہر ڈیڈ بھی یوں گھر سے باہر نہ جاتے۔“ زمین گیراج کی طرف بڑھے، اور اپنی گاڑی نکال کر ابرار احمد کا پیچھا شروع کر دیا۔ ابرار احمد کی گاڑی کا رخ اسی میدان کی طرف تھا۔ جہاں اس نے جلتے گلاب کا پودا دیکھ لیا تھا، اور وہ صبح غائب تھا۔ زمین بہت زیادہ پریشان تھا۔ ابرار احمد نے گاڑی روک دی۔ اور اسی میدان کی طرف جانا شروع کر دیا۔ وہاں دو بندے کھڑے ابرار احمد کے منتظر تھے، ان کے ہاتھوں میں بڑے گیلے میں وہی جلتے گلاب کا پودا تھا، جس میں سوہا کا عکس دکھائی دیتا تھا۔ اب نوری اور سانول ابرار احمد سے بات کر رہے تھے۔ اور زمین اچھے خاصے فاصلے پر کھڑے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ مگر اس پر یہ باتیں، یہ انکشافات، ایٹم بم بن کر گرے تھے۔ اس سارے منصوبے کا ماسٹر مائنڈ ابرار احمد تھے۔ جو اب اس قصبے سے تنگ آ گئے تھے۔ اور جلتے گلاب کا پودا سمندر برد کر کے سوہا کی زندگی ایک جھٹکے میں ختم کر دینا چاہتا تھا۔ اس کے دونوں گروگوں نے، جلتے گلاب کا پودا پکڑ کر اٹھایا، اور ابرار احمد کے کہنے پر کا رکی ڈگی میں ڈال دیا۔ اب ان کی گاڑی کا رخ ساحل سمندر کی طرف تھا، اور زمین جو میدان میں بیٹھ گیا تھا، سب کچھ سن چکا تھا۔ وہ اٹھا، اس نے اپنی گاڑی اشارت کی، اور ان کے پیچھے جانا شروع کر دیا۔ اس نے

آپ یہاں سے اٹھ کر اس سامنے خالی ٹیبل پر بیٹھ جائیں۔ مجھے اچھی لڑکوں سے ملنا پسند نہیں رہا ہے۔“ ماہ نور نے اسے دیکھ کر چپھٹے لہجے میں کہا۔

”مس ماہ نور آئی۔۔۔!! مگر مجھے آپ سے کام تھا۔۔۔!! پلیز میری بات تو سنیں۔۔۔!!“ شمرز عرف روز کہہ رہا تھا۔ ماہ نور اس کی بات سن کر مسکرائی۔ اور پھر اسے دیکھ کر کہہ دیا۔

”مسٹر شمرز۔۔۔!! میں نے لوگوں کے کام آنا چھوڑ دیا ہے۔۔۔!! یو آر کم ٹو دارونگ پرسن۔۔۔!!“ اس نے ہونٹوں پر زہر خند سی مسکان نکھیری اور اس کے چہرے پر دھوئیں کے مرغولے چھوڑ کر اٹھ گئی۔ اب وہ اسے حیران نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور وہ جارہی تھی۔ اس نے ماہ نور کے بارے میں جو کچھ سنا تھا۔ وہ دوسروں کی پرواہ کرتی ہے۔ انجان ماڈرن لڑکوں سے دوستی کی شوقین ہے۔ وہ نئے لڑکوں کو اپنے ساتھ رکھتی ہے، اور ان سے پیار بھی کرتی ہے، اسے لگا، وہ سب کچھ غلط تھا۔ وہ بھی تو اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے آیا تھا۔ ایک بہت بڑا پراجیکٹ تھا۔ جو اس پراجیکٹ کا ڈائریکٹر ہیڈ تھا۔ وہ ماہ نور کے باپ ندیم اعوان کا دوست تھا اور اگر وہ ماہ نور کو چاہتا، تو ماہ نور کے کہنے پر ندیم اعوان اپنا سیاسی اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے شمرز کو وہ پراجیکٹ دلا سکتا تھا۔

”اوٹ۔۔۔!!“ شمرز نے مکا بنا کر ہوا میں لہرایا۔ اور بے دلی سے اٹھ کر جانے لگا۔

”یہ بتلی بھی بڑی سیانی ہو چکی ہے۔ اپنی باری آنے پر انکار کر کے چلی گئی۔ اپنی خوبصورتی سے بالکل بھی ایمپریس نہیں ہو سکی۔“ شمرز پارکنگ میں کھڑا سوچ رہا تھا۔ ہر طرف رات اترا آئی تھی، مگر کیفے کے اندر جیسے دن کا سماں تھا۔

☆.....☆.....☆

ابراہیم احمد کی گاڑی ساحل سمندر کنارے رک گئی، اور ابراہیم جلدی سے گاڑی سے باہر نکل آئے۔ نوری، اور سانول بھی گاڑی سے اب باہر آچکے

تھے۔ وہ دونوں مستعدی سے کاری ڈگی کھول کر اب جلتے گلاب کا پودا گلے سمیت نکال رہے تھے۔ زین بھی اچھے خاصے فاصلے پر گاڑی روک چکا تھا۔ زین گاڑی سے باہر نکل آیا، اور آرام آرام سے ان کی طرف بڑھنے لگا، ابراہیم اپنی کامیابی کے نشے میں مست سا ان دونوں کو دیکھ رہے تھے۔ وہ لوگ زین کی موجودگی سے بے خبر تھے۔ زین اپنی گاڑی اچھے خاصے فاصلے پر روک چکا تھا۔

”اس منحوس جلتے گلاب کو جلدی سے سمندر برد کر کے یہ قصہ ہی تمام کر ڈالو۔ اب میں مزید اس لڑکی کا نام نہیں سننا چاہتا ہوں۔ میری کامیابی کی راہ میں جو بھی آئے گا۔ میں اسے مٹا ڈالوں گا۔“ دائیں بائیں سے گھوم کر نوری اور سانول نے جلتے گلاب کا پودا پکڑ لیا۔ اب ان کا رخ سمندر کی طرف تھا۔ وہ قدم اٹھانے لگے تھے۔

”ڈیڈ۔۔۔!! تو پھر آپ مجھے بھی اس راہ سے ہٹا دیں۔۔۔!! میں بھی تو آپ کی راہوں میں ایک کاٹنا ہی ہوں ناں۔۔۔!!“ زین ایک دم سے ان کے سامنے آکر بول پڑا۔ ابراہیم احمد اسے یوں اچانک اپنے سامنے دیکھ کر چونک پڑے، ان کا رنگ زرد پڑ گیا۔ جیسے ان کا سارا خون چہرے سے کسی نے نچوڑ لیا ہو۔

”ویڈن ڈیڈ۔۔۔!! ویل ڈن۔۔۔!! بہت اچھا ٹھیل بچایا۔۔۔!! بہت اچھا ٹھیل کھیل۔۔۔!! ڈیڈ یو آر گنڈ پلیئر۔۔۔!! میں بتا رہا ہوں۔۔۔!! جلتے گلاب کا پودا میرے حوالے کر دیں۔ ورنہ میں وہ کروں گا کہ آپ کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا۔“ زین تالیاں پینتے ہوئے ابراہیم احمد سے کہنے لگا۔ نوری اور سانول اپنی جگہ پر بالکل ساکت ہو کر رک چکے تھے۔ ابراہیم احمد کی آنکھیں غصے کی حدت سے سرخ پڑ چکی تھیں۔ وہ نفی میں گردن ہلاتے رہے تھے۔

”زین۔۔۔!! ایسا مت کرو۔۔۔!! تم جاؤ۔۔۔!! جاؤ یہاں سے۔ یہ سب میں نے کیا ہے۔۔۔!! اپنے باپ کو مت روکو۔۔۔!! میں بہت برا بن گیا ہوں۔۔۔!! میں رکنے والا نہیں ہوں۔ برائی کے

رہتے پر جانے والا اپنے انجام سے بے فکر ہو جاتا ہے۔ وہ کچھ نہیں مانتا ہے۔“ ابراہیم احمد ہاڑ پڑے۔

”ڈیڈ۔۔۔!! آپ کا خون ہوں ناں۔۔۔!! ضد تو مجھ میں بھی جیسے آپ ہی سے ملی ہے۔۔۔!! میں کٹ تو سکتا ہوں۔ مگر جھک نہیں سکتا۔ میں یہاں سے خالی ہاتھ نہیں جاؤں گا۔۔۔!! جلتے۔ گلاب کو اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔۔۔!!“ زین نے باپ کو جیسے پیچھے والے انداز میں لفظ لفظ بتادیا۔

”نوری، سانول۔۔۔!! اس منحوس جلتے گلاب کے پودے کو سمندر برد کر دو۔۔۔!! تم دونوں کا مشن ہے۔۔۔!! اپنا کام ختم کر دو اور یہاں سے چلے جاؤ۔“ ابراہیم احمد نے نور البشر عرف نوری اور سانول سے چیخ کر کہا۔ وہ دونوں تیز قدموں سے سمندر کی طرف جانے لگے اور زین کا چہرہ بالکل سرد پڑ گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے پستول اپنے بلٹ سے نکال کر ابراہیم احمد کی طرف کردی، ابراہیم بیٹے کو مقابلہ دیکھ کر زہر خند سا ہنس رہے تھے۔

”ڈیڈ۔۔۔!! آپ ان کو روک دیں۔ ورنہ! میں گولی چلا دوں گا۔۔۔!!“ زین مضبوط لہجے میں بولا تو ابراہیم قہقہہ لگا کر ہنس پڑے، انہوں نے ابراہیم کو دیکھا۔ تو کس نے روکا ہے۔ چلاؤ گولی اور آج دیکھ لیتے ہیں۔ تم میں کتنا دم ہے۔ ایک جلتے پودے کے لیے تم میری جان لے سکتے ہو یا نہیں۔ مگر یاد رکھو اگر تم میری جان لینا ہی چاہتے ہو تو لے لو اگر تم اس گلاب کو پانا چاہتے ہو تو تمہیں میری لاش پر سے گزرنا ہوگا۔۔۔!!“ ابراہیم احمد دل جلانے کے انداز میں کہہ رہے تھے اور زین کی انگلیوں کی گرفت ٹریگر پر سخت ہو رہی تھی۔ وہ جیسے فیصلے کی گھڑی پر کھڑا تھا۔

☆.....☆.....☆

رات کے اندھیرے پھیل چکے تھے، پرائیویٹ رومز میں صرف سوہا اور روبہا تھیں اور کوئی مزید پیشکش نہیں تھا جو پرائیویٹ روم میں ٹھہرا ہوا تھا۔ عموماً تو ڈاکٹر بھی رات کو چلے جاتے تھے صرف کمپاؤنڈر وغیرہ رہ

جاتے تھے۔ مگر اسپتال میں کوئی ایک ہاؤس چاب کا ڈاکٹر ہر ڈیپارٹمنٹ میں ضرور ڈیوٹی کرتا تھا۔ اور ایمر جنسی میں تو بے شمار ہوتے تھے۔ جو نرسز کی ڈیوٹیز تھیں۔ مگر یہاں ڈاکٹر عاشر کے ڈیپارٹمنٹ میں چندا رش نہیں تھا، یہاں دن کے وقت بھی سکون ہوتا تھا، کوئے کے پیشرفت بہت کم ہوتے تھے، نہ ہونے کے برابر تھے۔ نرسز اپنے سارے کام ختم کر کے اپنے رومز میں جا چکی تھیں۔ اب وہ یا تو صبح نکلتی تھی۔ یا اگر کوئی ایمر جنسی ہوتی، تب باہر آتی تھی۔ روہا بھی کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے بے فکری سے صوفے پر سو چکی تھی اور ڈاکٹر عاشر بار بار گھڑی کی سوئیوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے اندر جیسے بے چین سی روح بھر چکی تھی۔ اسپتال کے اس طرف بالکل گہری خاموشی تھی۔ کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ اپنے روم سے باہر نکلا۔ اب اس کا رخ میڈیسن روم کی طرف تھا، وہاں پہنچ کر اس نے نشے کی دوا اٹھائی، اور رومال پر مل دی۔ یہ دوا کے لیے تھا، جو شیطانی کام وہ کرنا چاہ رہا تھا۔ وہ روہا کی موجودگی میں نہیں کر سکتا تھا۔ وہ کسی بھی وقت جاگ سکتی تھی۔ اب وہ کوریڈور میں بہت سلو قدم اٹھا رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں رومال تھا۔ جو نشے کی دوا سے بھرا تھا۔ اور دوسرے ہاتھ میں کمرے کی چابی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ دروازے پر پرک گیا۔ اس نے بہت آہستہ بنا آواز پیدا کیے، دروازے میں چابی ڈال دی اور ہینڈل گھمایا۔ بنا آواز کے بہت آرام سے اس نے دروازہ کھول دیا۔ اب وہ کمرے کے اندر تھا۔ اس نے اسی طرح آہستہ سے دروازہ بند کر دیا۔

☆.....☆.....☆

”ڈیڈ۔۔۔!! آپ سمجھ نہیں رہے ہیں۔۔۔!! اگر آپ نے جلتے گلاب کو سمندر برد کر دیا۔۔۔!! تو میں بھی ختم ہو جاؤں۔۔۔!! جس امید پر میں زندہ تھا۔۔۔!! وہ یہ جلتے گلاب کا پودا تھا۔۔۔!! اللہ جب کسی کو کسی کے سامنے سچائی بیان کرتا ہے۔ تو ایسے کھلی آنکھوں سے سب کچھ دکھا دیتا

ہے۔۔۔ آپ نے کیا سمجھا تھا۔ میں کبھی کچھ نہیں جان پاؤں گا۔۔۔!!“ زین کہہ رہا تھا۔

”تم، اس جلتے گلاب کے لیے مجھ پر گولی چلانا چاہتے ہو۔۔۔!! تو چلاؤ۔۔۔!! میں بھی پیچھے بیٹھے والوں میں سے نہیں ہوں۔۔۔!! تم ایک نئی تاریخ رقم کرنا چاہتے ہو تو کرو۔ کل زمانہ کہے گا۔ ایک بیٹے نے باپ کو مار ڈالا تو تمہارا کیا جواز ہوگا؟ یہ جلتے گلاب کا پودا۔ سب تم پر لعنت ملا مت کریں گے، اور تمہاری مام کا کیا ہوگا؟“ ابراہیم احمد سینہ تان کر کہہ رہے تھے۔

”ڈیڈ۔۔۔!! ان سے کہیں کہ رک جائیں۔۔۔!! آئی سویر۔۔۔!! میں گولی مار دوں گا۔۔۔!!“ زین چیخ رہا تھا۔ زین کی آنکھیں کانپ سی رہی تھیں۔

”تو چلا دو۔۔۔!! میں بتا چکا ہوں۔۔۔!! اس گلاب کے پودے کو حاصل کرنے کے لیے تمہیں میری لاش پر سے گزرنا ہوگا۔۔۔!! میں ان کو روکنے والا نہیں ہوں۔“ ابراہیم احمد قدم قدم اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ زین نے پستول کا رخ اپنی کینٹی پر لگا دیا۔

”ڈیڈ۔۔۔!! اگر آپ میری طرف مزید ایک قدم بڑھے۔۔۔!! یا ان دونوں کو نہیں روکا۔۔۔!! تو میں اپنی جان لے لوں گا۔۔۔!!“ زین نے باپ کو دھکے مارا۔ ابراہیم احمد جو اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ ٹھٹھک کر رک گئے۔ اس نے دیکھا۔ زین کی شمشیر اڑاتی آنکھوں میں اب صرف حیرانی تھی۔ زین بالکل ساکت ہو چکا تھا اور ابراہیم احمد نوری اور سانول کو دیکھ رہے تھے۔ جو ساحل سمندر کے قریب پہنچ چکے تھے۔ زین نے ٹریگر پر انگلی کا دباؤ مزید بڑھا دیا۔

”زین۔۔۔!! تم مجھے ایسے بلک میل نہیں کر سکتے۔۔۔!! تم ایسا نہیں کر سکتے؟ اگر تم نے ایسا کیا تو میں مرجاؤں گا۔“ ابراہیم احمد کا لہجہ سراسر بدل چکا تھا۔ وہ زین سے اب بیٹھے لہجے میں بات کر رہے تھے۔

”ڈیڈ۔۔۔!! جب آپ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔۔۔!! تو میں بھی کر سکتا ہوں۔۔۔!! میں بتا رہا

ہوں۔۔۔!! میں خود کو ختم کر دوں گا۔۔۔!! میں اپنی جان لے لوں گا۔۔۔!! پھر ساری زندگی، اس دولت کو پوجتے رہنا۔۔۔!! جس کے لیے آپ نے میری زندگی تباہی کے وہانے پر لا کر کھڑی کر دی ہے۔۔۔!!“ زین نے نتھنے پھلائے۔ وہ جیسے رو رہا تھا۔ ابراہیم احمد نفی میں گردن ہلا رہے تھے۔ اچانک فائر کی آواز گونج اٹھی۔ ابراہیم احمد کے ہاتھوں کے طوطے جیسے اڑ گئے۔ زین لہرا کر گر گیا۔ اور ابراہیم احمد منہ کھلا، اور حواس باختہ ہو گئے۔

☆.....☆.....☆

کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے، ڈاکٹر عاشر آہستہ سے اندر جانے لگا۔ اب وہ روہا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ روہا صوفے پر سوئی ہوئی تھی، وہ آہستہ آہستہ روہا کی طرف بڑھا، اور نشہ آور دوا سے بھرا ہوا رومال اس کے منہ پر رکھ دیا۔ وہ ہلکی سی ایک لمبے کے لیے کسمپاسی، اور پھر وہ ہوش و خرد سے بیگانہ ہوتی چلی گئی۔ اب ہلکے نیم اندھیرے میں ڈاکٹر عاشر کا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ اس کی خیانت بھری مسکراہٹ بہت ہی عجیب سی لگ رہی تھی۔ اب وہ قدم قدم روہا کی طرف بڑھ رہا تھا۔ سوہا بہت معصوم سی سوئی ہوئی تھی، وہ ہر چیز سے بے خبر لگ رہی تھی۔ ڈاکٹر عاشر اب اس کے سر پر ہاتھ رکھتا تھا پھر وہ مسکرا اور اس نے ناک سوہا کے وجود سے قریب کر دی، اور لمبی لمبی سے سانس لیں۔ اس کے اندر گلاب کے پھولوں کی خوشبو رچ بس گئی، اب وہ بار بار ایسا ہی کر رہا تھا۔ وہ ایسا کرتے ہوئے عجیب سی مدھوشی کا شکار ہو رہا تھا۔

”آج ملن کی رات آہی گئی ہے۔“ ڈاکٹر عاشر نے سوہا کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

☆.....☆.....☆

زین نے گولی چلا دی تھی، اگلے لمبے میں زین جیسے لہرا کر گر گیا تھا، ابراہیم احمد اس کی طرف دوڑ پڑے۔ ان کی آنکھیں باہر کو نکلی ہوئی تھیں۔ سانس جیسے پھول رہی تھی اور ہاتھ پاؤں کام کرنا چھوڑ چکے تھے۔ زین

جاؤ۔۔۔!! میں تو کچھ کرنے کے قابل تک نہ تھہرا۔ میں تو سوچ رہا تھا۔ تم مجھے مار ڈالو گے۔۔۔!! یہ تم نے کیا ستم کر دیا۔ جسے میں سہ نہیں سکتا ہوں۔ تمہاری ماں تو جیتے جی مر جائے گی۔ تمہارا سب کچھ جاننے کے بعد تو میں مرجانا چاہتا تھا۔ میں نے تمہارا بھروسہ توڑا تھا۔ میں خود تمہارے ہاتھوں گولی کھانا چاہتا تھا۔ زین یہ تم نے کیا کر دیا۔ کیا کر دیا؟“ ابراہم خود کو غصے سے سینہ لگا نوری اور سانول تک اس کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔

”زین کاش۔۔۔!! تم مجھے ایک موقع دے تو دیتے۔۔۔!! کاش۔۔۔!! میں سب کچھ ٹھیک کر دیتا۔۔۔!! اب مجھے بھی جینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ میں بھی اسی پستول سے مرجانا چاہتا ہوں۔ میں تمہارے بعد تمہاری ماں کا سامنا کیسے کروں گا؟“ انہوں نے زین کے ہاتھ سے پستول لینی چاہی، مگر اس پر زین کی گرفت مزید مضبوط ہو گئی، زین جو ابراہم کی گود میں تھا۔ اچانک اس کے لب ہلے، وہ مسکرا اٹھا، اب ایک دم جھٹکے سے اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اور بالکل سیدھا ہو گیا۔

ابراہم احمد حیرانگی سے اسے دیکھنے لگے۔ زین اب کھرا ہو رہا تھا۔ اپنے کپڑے جھاڑ دیے۔ اور ابراہم احمد سے جدا ہو گیا۔ ابراہم احمد پر جیسے سکتہ طاری ہو چکا تھا۔ وہ جیسے رونا بھول چکے تھے۔

”ڈیل۔۔۔!! آپ کو آئینہ دکھانا بہت ضروری ہو گیا تھا۔۔۔!! گولی میں نے خود کو نہیں ماری تھی۔ صرف۔۔۔!! مارنے کی ادکاری کی تھی۔۔۔!! آخر میں ایک ادکار بھی تو ہوں نا۔۔۔!! گولی چھو کے میرے کان کے پیچھے چلی گئی تھی۔۔۔!! میں جسٹ ایکٹ کر رہا تھا۔۔۔!! صرف ایکٹ۔۔۔!! میری کامیاب ادکاری کے پیچھے تو لوگ دیوانے ہیں۔۔۔!!“ ابراہم احمد کا سکتہ ٹوٹ گیا اور وہ اٹھ کر روتے ہوئے زین کے گلے سے لگ گئے۔ وہ اسے بے تحاشا چوم رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

ساکت بڑا تھا۔ پستول ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ بالکل ساکت بڑا ہوا تھا۔ اور ابراہم احمد اس کے پاس پہنچ چکے تھے۔ وہ گھٹنوں کے بل جھک کر اس کے ساتھ جڑ کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے زین کو اپنی گود میں بھر لیا اور دھاڑیں مار مار کر چیخنا شروع کر دیا۔ اندھیرا تھا۔ صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔

”زین، میرے جگر کے ٹکڑے، یہ تو نے کیا کر دیا۔۔۔!! تو نے اپنے باپ کو برباد کر ڈالا۔ اسے ہرانے کے لیے اپنی ہی جان لی۔ ہائے میں تو برباد ہو گیا۔۔۔!! میں جیتے جی مر گیا۔۔۔!!“ وہ رورہے تھے۔ اندھیرے میں انہیں صاف نظر بھی نہیں آ رہا تھا۔ زین کی گردن ڈھلک گئی تھی، ابراہم احمد اس کا ہاتھ چوم رہے تھے۔

”زین۔۔۔!! یہ تم نے کیا کر دیا۔۔۔!! کیا کر دیا۔۔۔!! خدا کے لیے اٹھ جاؤ۔۔۔!! جو تم چاہو گے۔۔۔!! وہی کروں گا۔۔۔!! مجھے اس دنیا سے کچھ بھی نہیں چاہیے۔۔۔!! کچھ بھی نہیں۔۔۔!! میں تمہیں تمہاری ساری خوشیاں لوٹا دوں گا۔۔۔!! میں تم سے کہہ رہا ہوں تم اٹھ جاؤ۔ تم اپنی ساری خوشیاں پاؤ گے۔۔۔!!“ زین کے چہرے پر ان کا بھل بھل آنسو گر رہا تھا۔ زین کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو رہا تھا۔ نوری سانول بھی فائر کی آواز سن کر رک چکے تھے۔ ان کے قدموں سے سمندر کا پانی ٹکرا رہا تھا۔ وہ مڑ کر دیکھنے لگے۔ تھے، جلتے گلاب کا پودا وہ ساحل سمندر پر رکھ چکے تھے، جو ابھی تک جل رہا تھا۔ سانول نے نوری کو دیکھا، اس نے گم لے گا کنڈا اچھوڑ دیا۔ گملہ زمین پر ایک طرف سے جھک گیا، نوری نے بھی دوسری طرف والا کنڈا اچھوڑ دیا۔ اب جلتے گلاب کا پودا زمین پر پڑا ہوا تھا اور سانول اور نوری ابراہم احمد کی طرف دکھ رہے تھے۔ ان دونوں کے قدموں تک سمندر کی لہریں آگئی تھیں۔

”یہ میں نے کیا کر دیا؟ یہ مجھ سے کیا ہو گیا ہے؟ کتنی بڑی ہار میرے مقدر میں ٹھہری ہے۔ زین اگر تم نہیں رہے۔ تو میں مرجاؤں گا۔ بیٹا۔۔۔!! اٹھ

”اوہ۔۔۔! تم محسوس کر سکتی ہو۔۔۔! مگر کچھ کر نہیں سکتی ہو۔۔۔! شاید تم مجھے سن سکتی ہو۔۔۔! انہیں یقیناً۔۔۔! تم مجھے دیکھ بھی سکتی ہو۔۔۔! مگر تم مجھ سے خود کو بچا نہیں سکو گی۔۔۔! ویسے تم نے وہ کہانی سنی ہے۔۔۔! جس میں ایک شہزادی جادوئی نیند سوجاتی ہے، اور ایک راکشش، شہزادے کا روپ دھار کر اس کو دیکھنے آ جاتا ہے، اور اس پر عاشق ہو جاتا ہے۔ مگر اس درندہ نما شیطان سے صبر نہیں ہوتا ہے۔ وہ شہزادی کے ساتھ زیادتی کرتا ہے۔ اور اس کے وجود میں نئی زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ اس کے وجود میں دو زندگیاں شامل ہو جاتی ہیں۔ اور پھر اس کام کی وجہ سے جادوئی نیند سے وہ بیدار ہو جاتی ہے۔ میں بھی تمہیں بیدار کرنے کے لیے آ گیا ہوں۔ وہ ہماری کہانی تھی۔ ڈیول اینڈ پرنسس۔۔۔! “ڈاکٹر عاشر کا خوبصورت چہرہ اس وقت بہت بھیاں لگ رہا تھا۔ جیسے وہ کوئی قبیح شیطان کا چہرہ ہو۔ اچانک وہ سوہا پر جھک گیا۔ اور اس کے گردن پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ اس نے سوہا کو چومنا شروع کر دیا۔ سوہا کے آنسو دھڑا دھڑ بہتے چلے گئے۔

☆.....☆.....☆

زین کو گلے سے لگا کر ابرار احمد روئے جا رہے تھے، باپ بیٹے نے جیسے اپنی اپنی ضد چھوڑ دی تھی، ابرار احمد کی آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں۔ نوری اور سانول اس منظر کو دیکھ کر مسکرانے لگے تھے۔ اچانک سانول کی نظریں جلتے گلاب کے پودے پر تنگ گئیں۔ اس کو حیرانگی ہوئی، اس نے نوری کا ہاتھ پکڑ کر جھنجھوڑا اور اس کی توجہ جلتے گلاب کے پودے کی طرف کرائی۔ نوری نے اسے اشارے سے ”کیا ہے۔“ پوچھا۔ ہاتھ کے اشارے سے سانول نے جلتے گلاب کا

اشارہ کر دیا۔ جلتے گلاب کے اندر آگ میں تینوں پھولوں میں سوہا کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ اس کے قریب کوئی کھڑا تھا، جو بیک سائیڈ سے نظر آ رہا تھا۔ جو اس کے قریب کھڑا تھا۔ اور اس کے بالوں میں ہاتھ بھیر رہا تھا۔ وہ اس سے کچھ کہہ رہا تھا۔ وہ شرٹ لیس نظر آ رہا تھا۔ جلتے گلاب کے پودے میں آگ مزید تیزی سے دھنکنے لگی۔ جیسے وہ پودا شدت سے جل رہا ہو۔

”یہ لڑکی تو مصیبت میں ہے؟ کوئی اس کے ساتھ زیادتی کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔۔۔!“ سانول نے نوری سے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”اب ہمیں کیا کرنا چاہیے۔۔۔! جلدی سے جلتے گلاب کا پودا زمین کے اندر دابنا چاہیے۔۔۔! اور نہ یہ لڑکی مرجائے گی۔۔۔! تمہیں تو یاد ہوگا۔ بڑے سرکار نے ایسا ہی کہا تھا۔“

”مگر ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔۔۔!“ سانول بہت گھبرا گیا تھا۔ اسے نئی فکر لگ گئی تھی۔

اسی ساحل سمندر کے ساحل پر گڑھا کھود کر اس کو ریت میں دفن کر دیتے ہیں۔ جو نبی یہ دفن ہو جائے گا۔۔۔! جلتے گلاب کا پودا بجھ جائے گا۔۔۔! اور اس میں تیز درجہ حرارت کو آڑی مل جائے گی۔ اور سیدھی اپنے جسم میں چلی جائے گی۔۔۔!“ سانول نے جلدی سے کہا، نوری جلتے گلاب کے پودے کو دیکھ رہا تھا۔ جس میں وہ لڑکا سوہا سے جیسے کچھ کہہ رہا تھا۔ اس کی نیت سے صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔

”رک۔۔۔! کہیں سائیں ناراض نہ ہو جائیں۔۔۔! ہمیں ان کو بتانا چاہیے۔۔۔! ان کے مزاج کا کچھ پتہ نہیں چلتا ہے۔۔۔!“ نوری نے اس کو آگاہ کر دیا۔ سانول بھاگتا ہوا، ابرار اور زین کی طرف آنے لگا۔ ابرار زین کے گلے سے لپٹا ہوا اس کے کندھے پر اپنے آنسو گرا رہے تھے۔ اب وہ اسے کسی بچے کی طرح بے ساختہ چوم رہے تھے۔ زین کے شرٹ میں



باپ کے آنکھوں کے سارے آنسو جذب ہو گئے تھے۔  
 ”سائیں۔۔۔ سائیں۔۔۔ سائیں۔۔۔ سائیں۔۔۔“  
 بھاگتا ہوا چیختا ہوا ان کے پاس آ رہا تھا۔ ابرار احمد زین  
 سے جدا ہو گئے اور نا سمجھی سے سانول کو دیکھنے لگا۔  
 ”سانول کیا بات ہے؟“ ابرار احمد نے اسے  
 حیرانگی سے دیکھا۔

”سائیں۔۔۔ جلتے گلاب میں جو لڑکی قید  
 ہے۔۔۔ اس کی زندگی خطرے میں ہے۔۔۔ کیا  
 کریں؟ اس کے ساتھ کوئی زبردستی کرنا چاہتا ہے۔ وہ  
 لڑکی تو بے بس ہے۔ کچھ نہیں کر سکتی ہے۔ اگر اس کے  
 ساتھ زیادتی ہوگی، تو وہ مر جائے گی۔“ سانول نے ایک  
 ہی سانس میں بے صبری سے بتایا۔ زین اسے دیکھنے  
 لگا۔ اس کی آنکھوں میں آگ سی نظر آئی، وہ شدید غصے  
 میں تھا۔

”کیا بکواس کر رہے ہو؟ کیسے سوہا کی زندگی  
 خطرے میں ہو سکتی ہے؟ ابھی تو سب ٹھیک ہو رہا  
 تھا۔ ڈیڈ ہی پاگل انسان کیا بکواس کیے جا رہا ہے۔“ زین  
 نے بے صبری سے تیز لہجے میں اسے سنایا۔  
 ”سائیں۔۔۔ جلتے گلاب میں، اس لڑکی  
 کے پاس کوئی لڑکا نظر آ رہا ہے۔۔۔ اور اس لڑکی کی  
 آنکھوں سے آنسو نکل رہے ہیں۔۔۔ بڑے سرکار  
 نے صاف کہا تھا۔ اگر کوئی اس کی حالت میں لڑکی ہوں  
 گی۔۔۔ اور کوئی اس سے زبردستی کرنے کی کوشش  
 کرے گا، تو وہ مر جائے گی۔ یہ گلاب کا پودا خود بخود بجھ  
 جائے گا۔“ سانول نے اسے ایک ہی سانس میں ساری  
 بات سمجھانے کی کوشش کی۔

”میں کچھ نہیں جانتا ہوں۔۔۔ مجھے سوہا کسی  
 بھی حالت میں بالکل ٹھیک ٹھاک چاہیے۔۔۔ اور نہ  
 میں اپنی جان لے لوں گا۔۔۔ ان سب کو روکنے کا  
 کوئی تاحصل ہوگا؟“ زین پوری قوت سے چیخا۔

”سائیں۔۔۔ ہم یہاں ساحل سمندر کے  
 ریت میں جلتے گلاب کا پودا دفن کر دیتے  
 ہیں۔۔۔ جیسے ہی پودا ریت میں دفن ہو جائے گا۔ یہ

خود بخود بجھ جائے گا۔ اس میں سے اس لڑکی کی قید روح  
 نکلے گی۔“ سانول نے اس کے جسم میں چلی جائے گی۔ اور وہ جاگ  
 جائے گی۔ پھر کوئی زبردستی اس کے ساتھ نہیں ہو سکے  
 گی۔ وہ اپنا بچاؤ کر سکے گی۔“ سانول نے بتایا۔

”تو جاؤ، میرا منہ کیا تک رہے ہو۔ فوراً چلتے  
 گلاب کا پودا زمین میں دبا دو۔۔۔ میں مزید یہ تماشا  
 نہیں دیکھنا چاہتا۔۔۔ ڈیڈ میں بتا رہا ہوں۔ اگر سوہا  
 کی عزت پر ذرا بھی آج آئی، تو میں سارے زمانے کو  
 جلا کر خاکستر کر دوں گا۔“ زین نے دہاڑ کر کہا، تو سانول  
 بھاگتا ہوا نوری کے پاس جانے لگا۔

”ڈیڈ۔۔۔ سوہا کی زندگی خطرے میں  
 ہے۔۔۔ میں اسے بچانا چاہتا ہوں۔۔۔ میں اس  
 شخص کو نہیں چھوڑوں گا۔۔۔ جو سوہا کی زندگی پر باد  
 کرنا چاہتا ہے۔۔۔ بس اس وقت، اس کی زندگی  
 بچانے میں میری مدد کریں۔۔۔“ اب زین تیزی  
 سے جلتے گلاب کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے پاؤں میں  
 جیسے پیسے لگ چکے تھے۔ وہ جلتے گلاب کے پاس تیزی  
 سے جا رہا تھا۔ اب وہ جلتے گلاب کے پاس کھڑا تھا۔ اور  
 گلاب کے پودے میں تینوں لگے گلاب کے پھولوں  
 کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ زین کو انتہائی شدید غصہ آیا  
 ہوا تھا۔ سوہا کے پاس کوئی کھڑا تھا۔ جو اس پر جھکا ہوا  
 تھا۔ وہ شخص شرت ٹپس تھا۔ اس نے چند گہری سائیں  
 لیں۔ جیسے وہ سوہا کی وجود کی خوشبو اپنے اندز اتار رہا ہو۔  
 اب وہ سوہا کی طرف جیسے غماز آلود نظروں سے دیکھ رہا  
 تھا۔ سانول گاڑی کی طرف چلا گیا۔ گاڑی کی ڈگی میں  
 پھاؤڑا پڑا ہوا تھا، وہ تیزی سے گاڑی سے پھاؤڑا نکال  
 کر اسی طرف آ رہا تھا۔ ساحل سمندر پر ریت بہت نرم  
 تھی، سانول اور نوری نے خشکی پر گڑھا کھودنا شروع  
 کر دیا۔ زین نے جلتے گلاب کو چھوا۔ اب اسے کوئی  
 کرنٹ نہیں لگا۔ جلتے گلاب کی حقیقت آشکار ہو چکی  
 تھی۔ اس لیے اسے کچھ کرنٹ نہیں لگا تھا۔ وہ بھی بیٹھ کر  
 پاگلوں کی طرح گڑھے سے ریت ہٹانے لگا تھا۔ اس  
 نے اٹھ کر کدال جلتے گلاب کے گملے پر مار دیا، اسی لمحے

255

جھٹکا دے کر گرایا۔ اور اس کو گریبان سے پکڑ کر اٹھایا۔ اور کئی کئی اس کے جڑے پر مار دیئے۔  
 ”تو اپنا چہرہ پہچانتا بھول جائے گا۔۔۔!! تو نے کیا سمجھ رکھا تھا۔۔۔!! تو کچھ بھی کرگزرتے گا۔۔۔!! زین کا سارا غصہ اس کی آنکھوں میں جیسے اتر آیا تھا۔ اس نے اس کے سر سے اپنا سر مارا۔ اور پھر تو جیسے اس پر جنون طاری ہو گیا۔ وہاں ابرار احمد آگئے۔

”زین۔۔۔!! اسے چھوڑ دو۔۔۔!! یہ مر جائے گا۔۔۔!!“ ابرار احمد نے بیٹے کو روکنے کی کوشش کی۔

”نہیں ڈیڈ، چھوڑیئے مجھے۔۔۔!! آج مجھے ایک خون کر لینے دیں۔۔۔!!“ زین نے ابرار احمد کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹایا، اور ڈاکٹر عاشر کو ایک مہر پور مکارسید کر دیا۔ وہ کئی قدم پیچھے چلا گیا، اور گر گیا۔

”زین۔۔۔!! میں تمہیں کسی کا قتل کرتا ہوں نہیں دیکھ سکتی۔۔۔!! اس کو حوالہ پولیس کیا جائے۔۔۔!!“ سوہانے دوڑ کر زین کو پکڑ لیا۔ ابرار احمد دونوں کو دیکھ رہے تھے۔

”سوہا۔۔۔!! ایک شرط پر اسے چھوڑ سکتا ہوں۔۔۔!!“ زین نے سوہا کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔  
 ”کیا؟ کبھی شرط؟“ سوہا گھبرا سی گئی۔ اور اسے حیرانگی سے دیکھنے لگی۔ زین نے اپنی بیلٹ اتار کر سوہا کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے کہا۔

”یہ لو۔۔۔!! اور اب تم اسے مارنا شروع کر دو۔۔۔!! ورنہ یہ میرے ہاتھوں ضائع ہو جائے گا۔۔۔!!“ سوہانے زین کے ہاتھ سے بیلٹ پکڑ لیا اور ڈاکٹر عاشر کے پاس آ کر رک گئی، وہ نیچے دیکھ رہا تھا۔ سوہانے اسے مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا، مگر مارا نہیں، بیلٹ زمین پر گر ادا۔

”نہیں۔۔۔!! زین۔۔۔!! یہ اس وقت ایک شیطان ہی سہی۔۔۔!! مگر یہ بھی میرا سمجھا تھا۔۔۔!! میرا علاج کر رہا تھا۔۔۔!! اس کو سزا قانون دے گا۔۔۔!! تم اسے چھوڑ دو اور پولیس کو فون

”ڈیڈ۔۔۔!! اس وقت مجھے صرف سوہا کی فکر ہے۔۔۔!! اگر اسے کچھ بھی ہوا تو میں اس دنیا کو آگ لگا دوں گا۔۔۔!! مجھے اس سے تیز گاڑی ڈرائیو کرنی چاہیے۔۔۔!! مجھے جلد سے جلد سوہا تک پہنچنا ہے۔۔۔!!“ زین نے گاڑی کی اسپید سوئی کو دیکھا، وہ آخری ہندسے پر رکی ہوئی تھی۔ ابرار احمد نے کچھ بھی نہیں کہا۔

گاڑی اسپتال کے سامنے رک گئی، زین دوڑتا ہوا گاڑی سے باہر نکل کر اسپتال کی عمارت کی طرف جانے لگا۔ اب وہ پرائیویٹ رومز کی طرف جا رہا تھا۔ چوکیدار ڈیپارٹمنٹ کے باہر بیٹھا ہوا سو رہا تھا۔ زین کے پیچھے ابرار احمد، اور سانول، نوری بھی بھاگ رہے تھے۔ اس نے جیسے ہی کوریڈور میں قدم رکھا۔ وہاں پیٹنٹ یونیفارم میں اسے سوہا دکھائی دی۔ وہ سیکورٹی گارڈ کے پیچھے کھڑی ہوئی تھی۔ وہ کانپ رہی تھی۔

”سوہا۔۔۔!!“ زین نے اسے پکارا۔  
 ”زین۔۔۔!! شکر ہے کہ تم آگئے۔۔۔!! ورنہ۔۔۔!! تمہاری سوہا مرنے والی تھی۔۔۔!!“ سوہانے جب مرکز زین کو دیکھا، تو بھاگتی ہوئی اس کے پاس چلی آئی۔ اور شدت سے اس کے گلے سے لگ گئی۔

”سوہا کیا ہوا ہے؟ اس نے تمہارے ساتھ کیا کیا ہے؟ مجھے بتاؤ گھبراؤ مت۔۔۔!!“ زین نے اسے اپنے سامنے کرتے ہوئے کہا، دونوں ہاتھوں کا پیالہ بنا کر اس کے چہرے کو اس میں پکڑ لیا۔ سوہا پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”اس شیطان نے میری عزت سے کھیلنے کی کوشش کی ہے۔۔۔!! اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ میری عزت محفوظ رہی۔“ زین نے سوہا کو چھوڑا، اور ڈاکٹر عاشر کی طرف چلا گیا۔

”بد ذات۔۔۔!! شیطان تیری یہ جرات۔۔۔!! میں تیرا وہ حشر کروں گا کہ ساری زندگی تو یاد رکھے گا۔۔۔!!“ زین نے اس کو بالوں سے پکڑ کر

کرو۔!!“ سوہانے زین سے کہا۔ زین پولیس کو فون کرنے لگا۔ سوہا اندر روم میں چل آئی۔ وہ روہا کو جگانا چاہ رہی تھی۔ مگر وہ بے ہوش تھی۔

☆.....☆.....☆

پولیس نے ڈاکٹر کو حراست میں لے لیا اور تحقیقات شروع کر دیں، سی سی ٹی وی فوٹیج سے صاف ظاہر تھا۔ ڈاکٹر عاشر سوہا کی عزت پر ڈاکا ڈالنے کے لیے اس کے روم میں گیا تھا۔ مگر بری طرح سے ناکامیاب ٹھہرا۔ اس وارڈ میں ایمر جنسی نافذ ہو گئی تھی۔ اسپتال کے بڑے بڑے ڈاکٹر دل کو خربل چکی تھی۔ وہ آنے والے تھے۔ بہت سارے دوسرے ڈیپارٹمنٹس کے اکا دکا لوگ بھی جمع ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر عاشر کو شرٹ پہننے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ اس کا کیریئر تو یہاں بس ڈسٹرائے ہی ہو چکا تھا اور شاید کسی دوسرے اسپتال میں ایسے بدنام، ناقابل کردار ڈاکٹر کو رکھا جانے کا سوچا جاسکتا تھا۔ فی الحال تو اسے سلاخوں کے پیچھے لے جایا گیا۔ ڈاکٹر عاشر نے کچھ بھی نہیں کہا۔ نہ اس جرم کا اقرار کیا، نہ انکار کیا۔ مگر روہا بے ہوش تھی اور ڈاکٹر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کو نشیل دوا بھاری مقدار میں دی گئی تھی۔ سوہا کا بیان بھی لے لیا جا چکا تھا۔ اس نے پولیس سے ریکویسٹ کر کے اس معاملے کو میڈیا سے دور رکھا تھا، اب وہ زین کے ساتھ اسپتال کے کوریڈور میں کھڑی اسے اپنی اس ایک سال کی داستان سنارہی تھیں اور زین بہت دلچسپی سے سن رہا تھا۔ زین سب کچھ جان چکا تھا۔ اس کی ہمت ہی نہ ہو سکی کہ وہ سوہا کو بتا سکے کہ ان سب کے پیچھے اس کے ڈیڈ ابراہیم کا ہاتھ تھا۔ اس نے اپنے باپ کا پردہ رکھ لیا تھا اور ابراہیم کے لیے یہی بہت تھا۔

☆.....☆.....☆

کچھ مہینے بعد

زین اور سوہا کا معاملہ ٹھیک ہو گیا تھا، زین کا رشتہ سوہا سے ہو چکا تھا۔ بڑوں کو بھی ساری خبر ہو چکی تھی۔ شاہ زر نے سوہا کی خوشی دیکھتے ہوئے کچھ

اعتراض نہ کیا۔ ابراہیم شرمندہ تھے۔ آج زین اور سوہا کی شادی ہو رہی تھی۔ شادی ہال کو برقی قمقموں سے سجایا گیا تھا۔ دونوں خاندان اور شہر کے معزز مہمان اس شادی میں شرکت کرنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ جلتے گلاب کی منحوسیت جیسے ختم ہو گئی تھی۔ ان مہمانوں میں ماہ نور بھی بڑی جگہ کرگھوم پھری تھی۔ آستان، اور کا شان شادی ہال کے باہر پٹانے پھوڑے رہے تھے۔ اور روہا شادی ہال میں ناچ ناچ کے تھک رہی تھی۔ روہا کو اس رات کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ زرتاشہ دلہن کو دیکھ کر داری صدقے ہوئے جارہی تھی۔ زین اور سوہا اس پر جگہ کر بیٹھے ہوئے چپکے چپکے باتیں کیے جارہے تھے۔ وہاں بہت سارے شو بزنس کے لوگ موجود تھے۔

”واہ۔۔۔! تم تو بہت بڑے اسٹار بن گئے ہو؟ مجھے بتایا تک نہیں، تم ایکٹنگ میں آگئے ہو۔۔۔!“ سوہانے زین کے کان میں سرگوشی کی۔

”ہاں۔۔۔! اور اب تمہاری باری ہے۔۔۔! بہت جلد تم پاکستان کی بہت بڑی نگر بننے والی ہو۔۔۔! تمہارا گانا جلتے گلاب بہت جلد ریلیز ہونے والا ہے۔۔۔! اس میں میں تمہارے ساتھ ماڈلنگ کروں گا۔۔۔!“

”تمہیں میرا وہ گانا جو میں نے یوٹی میں گایا تھا۔۔۔! ابھی تک یاد ہے۔۔۔!“ سوہانے اسے دیکھا، اور اسی لمحے فوٹو گرافر نے ان کی فوٹو اتاری۔ زین نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور ہنس دیا۔

”سناؤں۔۔۔! وہ گانا میں کیسے بھول سکتا ہوں۔۔۔! اس کی وجہ سے تو ہم ملے تھے۔۔۔! اور کچھ بھی گئے تھے۔۔۔! اور پھر مل گئے۔۔۔!“ جیسے ہی زین نے کہا، سوہا ہلکھلا کر ہنس دی۔ وہ باتیں کرتے رہے، باتوں کے دوران کافی وقت گزر گیا۔ اب ہال سے رخصتی کا وقت ہو گیا۔ سوہا باپ کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی، اب وہ روہا، اور زوہا سے مل رہی تھیں۔

”کہاں ہے؟ وہ دو چھوٹے شیطان؟“ روتے

گا۔۔۔!!“ وہ مسکرا رہا تھا۔ اور اسے ہی دیکھ رہا تھا، سوہا نفی میں سر ہلاتی رہی تھی۔ سوہا نے پٹل پکڑ کر ہوا میں فائر داغ دیا۔

”وہ بے گند۔۔۔!! نشانہ بازی کے بارے میں کیا ذرا۔۔۔؟“ زین اسے دیکھ رہا تھا، سوہا نے دوبارہ پٹل اور فائر کر دیا۔

”نشانہ بازی بھی سیکھ لیں گے۔۔۔!! تم سکھاؤ گے؟“ سوہا نے پٹل اس کی طرف بڑھایا۔ زین اپنا سر اثبات میں ہلاتا تھا۔ اب وہ اسے نشانہ بازی کے بارے میں بتا رہا تھا۔ دونوں فائرنگ کی باتیں کر رہے تھے۔ یہ شاید دنیا کا واحد دلہا تھا، جو شادی کی رات اپنی دلہن کو نشانہ بازی کی مشق کروا رہا تھا اور وہ اس سے سیکھ رہی تھی۔ زین نے ساری گولیاں ہوا میں داغ دیں۔ اور اس کے پیچھے گھوم کر آ گیا، اب وہ سوہا کے پیچھے کھڑا تھا، اس نے سوہا کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کا ہاتھ بالکل سیدھا کر دیا۔ اب دونوں کا ہاتھ سیدھا تھا، زین اور سوہا کے ہاتھ میں پستول تھا۔

”اب نشانہ باندھ لو۔۔۔!! ہاتھ بالکل اسٹریٹ رکھو۔۔۔!! اور جو تمہاری نگاہیں دیکھ رہی ہیں۔۔۔!! اس پر فائر کر دو۔۔۔!!“ سوہا نے نگاہیں سامنے رکھی اور پستول کا رخ اس پر تھا۔ اس نے ٹریگر دبایا، اور کلک کی آواز سنائی دی، کیونکہ پستول خالی تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو مسکرا کر دیکھا۔

”نیکسٹ ٹائم۔۔۔!! بھرے پستول سے نشانہ لینا۔۔۔!!“ تو سوہا نے اثبات میں سر ہلایا۔ یہ دنیا کا پہلا دلہا تھا، جو اپنی دلہن کو شادی کی رات فائر کرنا سکھا رہا تھا۔

سوہا نے خالی پستول زین کے چھاتی پر ٹک کر کے لگایا، اور اسے دیکھ کر مسکرائی۔ زین نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے گولی چلانے کو کہا۔ سوہا اسے کچھ دیر تک دیکھتی رہی۔ پھر اس نے فائر کر دیا۔ مگر پستول خالی تھا۔ وہ دونوں کھلکھلا کر مسکرانے لگے۔

**ختم شد**

روتے اس نے روپا سے پوچھا۔ چھوٹی روپا اس کے گلے سے لگ کر کہہ رہی تھی۔

”وہ دونوں آپنی تیری شادی کی خوشی میں پٹانے پھوڑ رہے ہیں۔۔۔!!“ روپا کی بات سن کر وہ ہنس دی۔ اب وہ گھر جا رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

دلہن بن کر سوہا پلانک پر بیٹھی ہوئی تھی، جب کمرے میں زین داخل ہوا۔ اور آکر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے سوہا کو جی بھر کر دیکھا۔

”سوہا۔۔۔!! آج کہو!! کیا مانگتی ہو؟ میں تمہیں اپنا سب کچھ دینے کو تیار ہوں۔۔۔!! اگر جان بھی مانگ لو، تو دروغ نہیں کروں گا۔“

”زین۔۔۔!! آپ مجھے مل گئے۔۔۔!! تو بس سب کچھ مل گیا ہے۔۔۔!! ویسے میں کچھ دیر چھت پر جانا چاہتی ہو؟ وہاں کوئی ہے تو نہیں؟“ سوہا نے معصومیت سے زین کو دیکھا۔ زین ہنس دیا۔

”نہیں۔۔۔!! کوئی نہیں ہے!! آؤ چلیں۔۔۔!!“

زین اٹھا، اس نے سوہا کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ اپنا کامدار بھنگا سنبھال کر اٹھ بیٹھی۔

”تمہارے پاس پستول ہے؟ مجھے چاہیے؟“

سوہا نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔۔۔!! مگر پستول کا کیا کرے؟“ زین حیران ہو گیا۔ اس نے کمرے کے دروازے پر پستول نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔

”یار۔۔۔!! اتنی بڑی خوشی ملی ہے۔۔۔!! فائر کرنا تو بنتا ہے نہ۔۔۔!!“ اس کی بات سن کر زین مسکرایا۔ اب وہ دونوں چھت پر آ گئے۔ سوہا کے ہاتھ میں پستول تھا۔

”ویسے فائر کرنا آتا ہے؟ یا ایویں سوشہ مار رہی ہو؟“ زین نے مذاق کیا۔

”آتا تو نہیں ہے۔ تم سکھا دو۔۔۔!!“ سوہا اسے دیکھنے لگی۔ زین نے پٹل لوڈ کر کے اس کی طرف بڑھایا۔

”اب فائر کرو۔۔۔!! ویسے ڈرتو نہیں لگے